جلد ۷۸ دسمبر ۱۹۷۲ء عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

تفہیم القرآن جلد ششم

کو قارئین تک پہنچانے کے لیے پوری مستعدی سے کام لیا جا رہا ہے۔ لیکن جلد بندی میں ذرا وقت لگ رہا ہے۔ تاہم جتنی تعداد میں جلدیں تیار ہو کر آ رہی ہیں وہ خریدار اور ایجنٹ حضرات کو بالاقساط ارسال کی جا رہی ہیں۔ ہماری انتہائی کوشش ہے کہ ہر آرڈر کی بروقت تعمیل کی جائے۔

ادارہ انفرادی خریدار اور ایجنٹ حضرات سے جلد ششم کی ترسیل میں تاخیر کا معذرت خواہ اور دلی تعاون کا شکر گزار ہے

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ، لاہور

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۷۸ | دسمبر ۱۹۷۲ء مطابق ذی قعدہ ۱۳۹۲ھ | عدد ۴

چندہ سالانہ	ماہ نامہ ترجمان القرآن، لاہور	قیمت فی پرچہ
دس روپے	۵-اے ذیلدار پارک۔ اچھرہ، لاہور	ایک روپیہ

ابوالخیر مودودی، پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

پرنٹر : محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

معلوم نہیں صدرِ مملکت ذوالفقار علی بھٹو سنجیدگی سے بنگلہ دیش تسلیم کرنے کے لیے عوام کے ذہنوں کو تیار کر رہے ہیں یا اِس ملک کے ستم زدہ لوگوں کے ساتھ، جن کے زخموں سے ابھی تک خون رِس رہا ہے، دل لگی فرما رہے ہیں۔ اُن کے طرزِ عمل کے بارے میں یہ اشتباہ اس لیے پیدا ہوا ہے کہ جس وقت سے اُن کے محسن فیلڈ مارشل محمد ایوب صاحب نے انہیں گمنامی کے دھندلکوں سے نکال کر شہرت و ناموری کے سنگھاسن پر بٹھایا ہے اُس وقت سے لے کر آج تک اُن کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل کے بارے میں بجز ایک بات کے کہ مسندِ اقتدار اور اُس کے جاہ و جلال کے ساتھ انہیں ایک والہانہ وابستگی رہی ہے، کوئی بات بھی یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی۔ ہر لمحہ رنگ بدلنے کو، عوام کے جذبات سے کھیلنے کو، ہر بات پر شیخی بگھارنے کو، بغیر سوچے سمجھے غیر ذمہ دارانہ باتیں منہ سے نکالنے کو، جہاں تعاون کی ضرورت ہے وہاں مزاحمت اور مخالفت کو اور جہاں ڈٹنے اور پامردی دکھانے کا موقع ہو وہاں جھکنے اور سرنگوں ہونے کو غالباً انہوں نے سیاست بازی خیال کر رکھا ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ سیاست کا کافی حصہ چالاکی اور عیاری پر مشتمل ہے لیکن اِس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اِس میں ایک بہت بڑا عنصر سنجیدگی اور وقار کا بھی ہے۔ ماضی قریب اور حال میں جتنے نامور سیاست دان میدانِ سیاست میں نمودار ہوتے ہیں اُن سب میں ایک بات قدرِ مشترک کے طور پر نظر آتی ہے کہ وہ اپنی نجی زندگیوں میں خواہ کتنے ہی مسخرے اور غیر سنجیدہ ہوں مگر قومی اور ملکی مسائل میں بڑی سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اُن کے فکر میں گہرائی، قول میں پختگی اور عزم میں ثبات ہوتا ہے۔ وہ کوئی بات بھی اُس وقت تک مُنہ سے نہیں نکالتے جب تک اُس پر اچھی طرح غور نہیں کر لیتے اور کوئی قدم اُس وقت تک نہیں اٹھاتے جب تک کہ اُس کے نتائج اور عواقب کا ہر زاویۂ نگاہ سے جائزہ نہیں لے لیتے۔

گذشتہ بارہ سال سے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی متحرک زندگی کے مختلف گوشے مختلف حیثیتوں سے عوام کے سامنے آرہے ہیں۔ قوم نے اُنہیں فیلڈ مارشل ایوب خاں کے مصاحبین اور درباریوں کے جلو میں ایک وزیر کی حیثیت سے بھی دیکھا ہے۔ پھر اُنہیں ایوب خاں کی مخالفت اور مخاصمت میں بھی سرگرمِ عمل پایا ہے۔ اس کے بعد انہیں عوام کے جذبات میں ہیجان پیدا کر کے مسندِ اقتدار سنبھالتے بھی دیکھا ہے۔ اور اب دس ماہ کی کارگزاری کا نقشہ بھی ہمارے سامنے ہے۔ مگر ہم نے بارہ سال کی اس طویل مدت میں انہیں کوئی ٹھوس اور دانشمندانہ کام کرتے نہیں دیکھا۔ ایوب خاں کے ساتھ اُنہوں نے پہلے آٹھ سال تو اِس درجہ نیازمندی سے گزارے کہ یُوں محسوس ہوتا تھا کہ اُن کی اپنی کوئی الگ فکر اور سوچ نہیں۔ اُن کا بیشتر وقت فیلڈ مارشل صاحب کی ثنا خوانی میں گزرتا تھا۔ وہ اُنہیں ملک کے واحد نجات دہندہ کی حیثیت سے ہر محفل اور مجلس میں پیش کرتے رہے اور انہیں یہ باور کراتے رہے کہ جو شخص یا گروہ بھی آپ سے اختلاف کرتا ہے اُسے پاکستان میں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ اِس ملک میں بلاشرکتِ غیرے صرف آپ کا راج قائم ہونا چاہیے اور جو فرد بھی اس کے خلاف لب کشائی کرتا ہے وہ وطن اور قوم کا دشمن ہونے کی بناء پر گردن زدنی ہے۔ اِس سارے عرصے میں بھٹو صاحب ایوب صاحب کو اپنے مخالفین کو ختم کرنے، خصوصاً دینی طبقوں کو مٹانے اور انتظامیہ کے اعلیٰ عہدیداروں کو سرکاری پارٹی کے عہدے تفویض کرنے کا مشورہ دیتے رہے۔

جب اپنے اِس محسن اور مُربّی سے اختلاف ہُوا تو انہوں نے معاہدۂ تاشقند کے بارے میں عوام کے جذبات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اِس مسئلے کو خوب اُچھالا اور سادہ لوح عوام کو یہی تاثر دیا کہ وہ اِس پٹاری سے کوئی بڑی خوفناک چیز نکالنے والے ہیں۔ اِس معاہدے کی بین بجا کر انہوں نے عوام کو اپنے گرد جمع کیا۔ پھر جھوٹی توقعات اور امیدوں کے سحر سے اُن کے ہوش و حواس کو معطل کیا۔ اور اپنے مخالفین کے خلاف نہایت مکروہ پراپیگنڈہ کر کے تختِ اقتدار پر پہنچنے کے لیے راستہ ہموار کیا۔ اور بالآخر "اُدھر تم اِدھر ہم" کا نعرہ لگا کر ایسے حالات پیدا کیے کہ عنانِ اقتدار پر ان کا قبضہ ہو ہی گیا۔ جب ہم صدر بھٹو صاحب کی گذشتہ بارہ سال کی سرگرمیوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں وہ محض کھیل تماشا معلوم ہوتی ہیں۔ معاہدۂ تاشقند کی پٹاری کو سامنے رکھ کر مجمع بازی کا کام تو خوب لیا گیا مگر اس میں سے کوئی خوفناک چیز برآمد نہ ہو سکی۔ جھوٹی توقعات سے عوام کو مسحور کر لیا گیا مگر اِس سحر سے اِن بے چاروں کی شبِ تاریک کا خاتمہ نہ ہو سکا۔ البتہ کوتہ اندیشوں کو کچھ وقت

کے لیے اُفق کے کناروں پر صبح کے آثار دکھائی دینے لگے ۔ مگر جلد ہی اُن پر حقیقت آشکار ہو گئی کہ یہ صبحِ صادق نہیں بلکہ صبحِ کاذب ہے جس کا مقصد دھوکے سے شبِ تاریک کو طوالت دینا ہے ۔

مسندِ اقتدار پر براجمان ہونے کے بعد بھی اُن کے طرزِ عمل میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا ۔ جس مارشل لا کو وہ تمام برائیوں کی جڑ سمجھتے تھے اُسے برقرار رکھنے پر پہلے مُصر رہے اور اُس کے لیے فضا ہموار کرنے کی پوری پوری کوشش کی ۔ مگر جب مخالف جماعتوں نے جبر و اکراہ کے ساتھ اِس لعنت کو ایک معینہ مدت تک گوارا کرنا قبول کر لیا تو دفعتاً اس کے خاتمے کا اعلان کر دیا ۔ اِس آناً فاناً اعلان کا مقصد یہ تھا کہ اس لعنت سے نجات دلانے کا سہرا کہیں حزبِ اختلاف کے سر نہ بندھ جائے بلکہ وہ تنہا صدرِ قوم کی پیشانی کی زینت بنے ۔
اِسی طرح وہ ایوب خاں کے حلقۂ ارادت سے نکلنے کے بعد اور تختِ اقتدار سنبھالنے سے پہلے صدارتی نظام کے مخالف اور وفاقی پارلیمانی نظام کے پُرجوش مبلغ اور داعی رہے اور ہر جگہ یہی کہتے رہے کہ پاکستان کے مخصوص حالات کے پیشِ نظر ہمارے لیے پارلیمانی نظام ہی صحیح اور مناسب ہے ۔ مگر اقتدار پر قابض ہونے کے فوراً بعد ہی صدارتی نظام کے گُن گائے جانے لگے ۔ اور اسے ملک و ملت کے لیے کیمیائے سعادت ثابت کیا جانے لگا ۔ اسے برقرار رکھنے پر اِس قدر زور دیا گیا کہ پُورا ایوانِ حکومت متزلزل ہو گیا ، اور اس کے نتیجے میں نہ صرف وزیرِ قانون اپنے عہدے سے الگ ہو گئے بلکہ بعض نمایاں کارکنوں نے بھی حکومت سے اپنا ناطہ توڑ لیا ۔

بھٹو صاحب کی اِس سیماب آسا طبیعت اور طفلانہ مزاج نے ہمیں بین الاقوامی طور پر بھی اچھا خاصا نقصان پہنچایا ہے اور دنیا کی نظروں میں ہمارا قومی وقار ناقابلِ بیان حد تک گرا ہے ۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران ان صاحب نے یو ۔ این ۔ او میں جو تقریر ارشاد فرمائی اور جس کے معرکہ آرا ہونے کا ملک میں خوب چرچا کیا گیا وہ محض ایک جذباتی تقریر تھی جو ممکن ہے کہ موچی دروازے کے جلسے کے لیے تو موزوں ہو مگر بین الاقوامی مُدبّرین کی مجلس کے لیے کسی طرح بھی موزوں نہ تھی ۔ امریکہ اور انگلستان کے پریس نے الفاظ کے تھوڑے سے تغیّر و تبدل کے ساتھ اُسے ایک نابالغ اور خام سیاستدان کی سطحی جذباتیت سے تعبیر کیا ۔ خصوصاً انہوں نے تقریر کے دوران بھارت کے نمائندے کو جن غیر شائستہ الفاظ سے مخاطب

کیا تھا اُس کی ہر جگہ مذمت کی گئی۔ وہ ملک کے اندر، یو۔این۔او کے اجلاس میں اور پریس کانفرنسوں میں بھارت کے خلاف ایک ہزار سال جنگ کرنے کی رٹ لگاتے رہے مگر جب ذرا خارجی دباؤ پڑا تو وہ اور ان کے مُربّی فوراً تاشقند روانہ ہو گئے اور وہاں اپنی بے بصیرتی کی وجہ سے جیتی ہوئی جنگ کو مذاکرات کی میز پہ ہار دیا اور اعلانِ تاشقند کے ساتھ ملک میں بے نیل و مرام لوٹے۔ معاہدۂ تاشقند کے سارے مراحل میں وہ ایوب خاں کے برابر کے شریک رہے۔ اُن کی جو تصاویر اُس وقت ملکی اور غیر ملکی اخبارات میں شائع ہوئی تھیں اُن میں انہیں اِس معاہدہ کی خوشی میں تالیاں پیٹتے ہوئے دیکھا گیا۔ ملک کے اندر واپس آنے کے بعد انہوں نے اس معاہدے کی بھرپور حمایت کی اور اُسے صدر محمد ایوب خاں کی فراست کا شاہکار قرار دیا۔ پھر اسمبلی میں انہوں نے اِس معاہدے کے حق میں پورے ڈھائی گھنٹے جو تقریر ارشاد فرمائی اُس میں اس کی بے حد تعریف کی اور اسے پاکستان کی فتح سے تعبیر کیا۔ مگر جب فیلڈ مارشل صاحب سے اَن بن ہو گئی تو یہ معاہدہ ایک سازش بن گیا۔ اور اس کا ذمہ دار ایوب خان کو ٹھیرایا گیا۔ اور خود اس سے بالکل بَری ہو گئے۔ اگر یہ معاہدہ واقعی ایک سازش تھی تو تاشقند میں اس پر دستخط کرنے سے انکار کیا جا سکتا تھا۔ اور وطن واپس آکر عوام میں اس امر کی دہائی دی جا سکتی تھی مگر اُس وقت تک اِس سازش کو اخفا میں رکھا گیا بلکہ اس سازش کو صدرِ مملکت کا عظیم کارنامہ قرار دیا جاتا رہا یہاں تک کہ انہیں وزارتِ خارجہ کے منصب سے الگ کر دیا گیا۔ اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ انہیں وزارت کا منصب ملکی مفاد سے کہیں زیادہ عزیز تھا اور جب اُس کے ساتھ چمٹے رہنے کی کوئی صورت باقی نہ رہی تو پھر معاہدۂ تاشقند کے پسِ پردہ جو "سازش" تھی اُسے آشکارا کرنے کی دھمکیاں دینی شروع کر دیں مگر آج تک اِس سازش سے ہزار وعدوں کے باوجود پردہ نہیں اٹھایا گیا اور وہ ابھی تک صیغۂ راز ہی میں ہے۔

اقتدار سے الگ ہونے کے بعد بھی اُن کی اس روش میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی۔ اگر وہ باہر کی دنیا کی طرف متوجہ ہوتے تو بھارت کے خلاف ہزار سال تک جنگ کرنے کی دھمکیاں دیتے۔ کبھی اہلِ بھارت کو یہ وعید سناتے کہ وہ عنقریب لال قلعے پہ جھنڈا گاڑنے کے لیے اپنے لاؤ لشکر سمیت آرہے ہیں۔ کبھی وہ بھارت کے وزیر خارجہ کی نقلیں اُتارتے اور اُن کے دوسرے لیڈروں کا مذاق اڑاتے اور اس طرح جلسوں میں عوام کو ہنسنے ہنسانے کے مواقع فراہم کرتے۔ جب زبان پہ امریکہ کا ذکر آتا تو اُسے بھی خوب ملاحیاں سُناتے مگر چند لمحے بعد ہی

اگر امریکی پریس کے کسی نمائندے سے ملنے کا اتفاق ہوتا تو پھر امریکہ بہادر کی تعریف و توصیف شروع کر دیتے۔ ملک کے اندر ایک ہی سانس میں اسلام کا دم بھرتے اور سوشلزم کا نعرہ بھی لگاتے۔ ایک جلسے میں سائنٹفک سوشلزم کے داعی کی حیثیت سے تقریر کرتے تو دوسرے جلسے میں اسلام کے جاں نثار و فدائی ہونے کا دعویٰ کرتے۔ اپنے آپ کو سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور نوکر شاہی کا شدید دشمن قرار دیتے مگر اپنے دربار میں ان طبقوں کی سب سے زیادہ پذیرائی بھی کرتے۔ اور ان کے وجود سے اپنی مجالس سجاتے۔ اُن کے اِس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اُن کے بارے میں کوئی بات بھی یقین اور وثوق کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی۔ اُن کے کسی قول پہ بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ جس شخص کی ساری سیاسی زندگی ہی لاف و گزاف اور کہہ مکرنی سے عبارت ہو اُس پہ اپنے اور پرائے کس طرح اعتماد کر سکتے ہیں۔ اُن کے بعض انجان اور عقل سے عاری ساتھی اُن کے اِس طرزِ عمل کے دفاع میں یہ کہتے ہیں کہ سیاست اِسی کا نام ہے۔ لیکن انہیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہونی چاہیے کہ اِس قسم کے چھچھورے پن سے سیاست دان کی اپنی ذات اور اس کی قوم کے وقار کو شدید دھچکا لگتا ہے۔ سیاست کی بساط قومی مفادات کی مہرہ بازی ہی سہی لیکن اس میں جتنی سنجیدگی اور وقار کا مظاہرہ کیا جائے اُسی قدر سیاست دان کی آبرو اور اُس کی قوم کی عزت بڑھتی ہے۔ ماضی قریب ہی میں ہمارے ہاں مسٹر محمد علی جناح کی صورت میں ایک ایسے نامور سیاستدان ہوئے ہیں جن کی سیاسی قابلیت کا سکہ مسلمان تو کیا غیر مسلم تک مانتے ہیں مگر دیکھیے کیا ان کی زبان سے کبھی ایسی غیر ذمہ دارانہ باتیں نکلیں جنہیں آج مسٹر بھٹو فخر سے ادا کرتے ہیں، کیا انہوں نے کبھی ایسی طفلانہ حرکتیں کیں جنہیں وہ آج اپنی سیاست بازی کا سب سے بڑا امتیاز سمجھتے ہیں؟ کیا انہوں نے کبھی اپنے مخالفین کو اسی انداز کی سوقیانہ گالیاں دیں جو آج صدر بھٹو کی زبان سے سننے میں آتی ہیں؟ کیا انہوں نے بھی اپنے مخالفین کی نقلیں اتار کر اور ان کے سوانگ بھر کر سامعین کو ہنسانے کی کبھی کوشش کی؟ کیا وہ بھی اسی طرح کی لاف زنی کے عادی تھے جس طرح کی لاف زنی بھٹو صاحب کا آج شیوہ بن گئی ہے؟ کیا انہوں نے بھی اہم معاملات کے فیصلے کے لیے وہ انداز اختیار کیا جو انداز بھٹو صاحب نے مجیب کی رہائی کے لیے اختیار کیا تھا، یا آج بنگلہ دیش کو تسلیم کرانے کے لیے کر رہے ہیں؟ اسلامی سیاست تو خیر اخلاق اور سنجیدگی کے نہایت اونچے معیار کی طالب ہوتی ہے مگر مغربی سیاست میں بھی ان صفات کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ اگر بساطِ سیاست سے یہ صفات ناپید ہو جائیں تو پھر سیاست دان اور مجمع باز میں کیا فرق باقی رہ جاتا ہے؟

علم نفس کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ جو شخص جس قدر لاف و گزاف سے کام لیتا ہے اور لوگوں کو دھمکیوں سے مرعوب کر کے انہیں خاموش کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ انتہائی بزدل ہوتا ہے۔ اور جو شخص سستی شہرت کے حصول کی خاطر اوچھے ہتھیار استعمال کرتا ہے یا جذبات کے اندر ہیجان پیدا کر کے اپنا کام نکالنے کا عادی ہوتا ہے اس کا دل اخلاص سے خالی ہوتا ہے۔ جلسوں کے اندر عوامی زبان استعمال کرنا اور اپنے آپ کو عوام کا خیر خواہ ثابت کرنے کے لیے منہ سے گالی تک نکال دینا، ہجوم کے اندر ھنگڑ اڈالنا اور سیٹیاں بجا کر رقص کرنا عوام دوستی کا کوئی صحیح معیار نہیں۔ عوام کی حقیقی خیر خواہی اور ان سے سچی محبت کا تقاضا یہ نہیں کہ اپنے آپ کو مصنوعی طور پر عوام کی سطح پر اتار کر انہیں یہ باور کرایا جائے کہ وہ اُن میں سے ہے بلکہ عوام دوستی کا صحیح اقتضاء یہ ہے کہ عوام کی سطح کو بلند کرنے کے لیے پورے اخلاص، دلسوزی اور دلجمعی سے کوشش کی جائے۔ جس طرح کوئی ہوشمند طبیب، مریض سے ہمدردی کا اظہار اپنے آپ کو وہ مرض لگا کر نہیں کرتا جس میں کہ مریض مبتلا ہے بلکہ اُس بیمار کو بیماری سے نجات دلانے کے لیے مخلصانہ کوشش کے ذریعے کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح کسی قوم کا حقیقی بہی خواہ اپنے طرزِ عمل سے یہ ظاہر نہیں کرتا کہ قوم جن عوارض میں مبتلا ہے وہ سارے اس میں بدرجۂ اتم موجود ہیں بلکہ قوم کو اُن سے بچانے کے لیے پوری قوت سے ہاتھ پاؤں مارتا ہے جو اسے اندر ہی اندر گھن کی طرح کھوکھلا کر رہے ہیں۔ یُوں تو اس سلسلہ میں کئی ایک مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں مگر ہم یہاں صرف دو مثالیں پیش کرتے ہیں۔ وہ شخص جو شراب کا عادی ہے اُس کا کوئی بہی خواہ اُسے شراب کے جام پیش کر کے اور شرابیوں کی سی حرکات و سکنات اختیار کر کے اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار نہیں کرتا بلکہ ام الخبائث کی مضرتیں بیان کر کے اور ساغر و مینا توڑ کر اس کی خیر خواہی کا فرض سر انجام دیتا ہے۔ اسی طرح اجتماعی زندگی میں سطحی جذباتیت کو فروغ دے کر کوئی سربراہِ قوم نہ اپنی قوم کو سنجیدگی کا سبق دے سکتا ہے اور نہ خود ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ ملک و ملت کو درپیش سنگین مسائل کے بارے میں کوئی مفید اور ٹھوس رائے قائم کرنے کے قابل بنا سکتا ہے۔ بنا بریں اپنے صدرِ مملکت سے ہماری گزارش یہ ہے کہ قوم کو جو روگ پہلے سے لگے ہوئے ہیں یا خود حصولِ اقتدار کے زمانے میں انہوں نے لگائے ہیں یا جن امراض میں ان کے غلط کار پیشرو اس ملت کو مبتلا کر چکے ہیں اب برسرِ اقتدار آنے کے بعد ان کے مداوا کی فکر کریں اور ملکی مفاد کے مطابق صحیح سمت میں قدم اٹھائیں۔ اس کا فائدہ کسی اور کو نہیں خود اُن کو پہنچے گا۔ لیکن اگر قوم کے مزاج کو خراب کرنے والی اور ملکی مفاد سے متصادم سرگرمیاں

انہوں نے جاری رکھیں جیسا کہ بنگلہ دیش کے مسئلہ پر عوامی انداز اختیار کر کے جاری رکھے ہوئے ہیں تو خطرہ ہے کہ اُن کی یہ غیر سنجیدہ روش نہ صرف اس قوم کو بالکل ناکارہ بنا کر رکھ دیگی بلکہ انہیں اپنی انتہائی محبوب اور دل پسند چیز (اقتدار) سے بھی بہت جلد محروم کر دے گی۔

بھٹو صاحب کے دورۂ سرحد کی جو تفصیلات اخبارات میں شائع ہو رہی ہیں اُن میں علاوہ اور بہت سی مضحکہ خیز باتوں کے ایک یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ وہ جماعت اسلامی اور اس کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے سیاسی اور علمی موقف پر بھی اظہار کرنے لگے ہیں اور اس وجہ سے وہ ترجمان القرآن اور "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ اِس معاملے میں ہماری اُن سے استدعا ہے کہ وہ چونکہ ملک کے سربراہ ہیں اس لیے انہیں اپنے بلند منصب اور مرتبہ کا خیال رکھنا چاہیے۔ اپنے عاقبت نا اندیش مشیروں کے کہنے سننے پر اپنے آپ کو اضحوکہ نہ بنانا چاہیے، کیونکہ اُن کی جگ ہنسائی سے ملک و ملّت کی رُسوائی ہوتی ہے۔ آپ کو اگر مولانا کے خلاف کچھ کہنا ہی ہے اور اُن پر سبّ و شتم کیے بغیر آپ کو اطمینانِ قلب نصیب نہیں ہوتا تو بہتر یہی ہے کہ آپ اُنہیں اور اُن کے رفقاء کار کو "فکس اَپ" کرنے کی دھمکیاں دے کر اپنے دل کا غبار نکال لیا کریں۔ مولانا کے افکار و نظریات اور اُن کے سیاسی موقف پر علمی انداز میں نقد و نظر نہ آپ کے بس میں ہے اور نہ آپ اس کے اہل ہیں، اور نہ آپ کے ساتھیوں میں اس کا کوئی اہل نظر آتا ہے۔ جو لوگ اپنے مخالفین کو گالیاں اور دھمکیاں دینے کی وجہ سے اپنے آپ کو دوسرے سے ممتاز سمجھتے ہوں اُن سے کسی علمی طرزِ استدلال کی توقع رکھنا بالکل عبث اور بیکار ہے۔ وہ جس کام میں ماہر ہیں انہیں وہی کام کرنے دیجیے اور آپ خود بھی ان علمی بحثوں میں نہ اُلجھیں، کیونکہ پھر آپ اپنے اصل میدان کو چھوڑ کر ایک ایسے میدان میں آجائیں گے جو آپ کے مزاج اور ذہنی ساخت کے اعتبار سے آپ کے لیے بالکل موزوں نہیں، اس لیے آپ کے جوہر کھلنے کے بجائے آپ کی سُبکی ہوگی۔ مثال کے طور پر دیکھیے کہ جب عوام آپ کی زبان فیض ترجمان سے مجلۂ ترجمان القرآن کا نام بھی غلط سنتے ہیں اور جب آپ انہیں یہ بتاتے ہیں کہ "مولانا نے 'سیاسی کشمکش' میں پانچ قومیتوں کی تائید کی ہے" تو آپ کی علمی قابلیت اور آپ کے مطالعے کی وسعت کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔ ترجمان القرآن کو لوگ گذشتہ ۴۳ برس سے پڑھ رہے ہیں، وہ اس کے مندرجات سے پوری طرح واقف ہیں۔ "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" پاکستان بننے سے پہلے اُن کے زیرِ مطالعہ ہے اور وہ اس کے موضوع سے بھی (باقی صفحہ ۸۰ پر)

تفہیم القرآن

الکافرون

(۲)

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

کہہ دو کہ اے کافرو[۱]، میں اُن کی عبادت نہیں کرتا جن کی عبادت تم کرتے ہو[۲]، نہ تم اُس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں[۳]۔ اور نہ میں اُن کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی عبادت تم نے کی ہے، اور نہ تم اُس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں[۴]۔ تمہارے لیے تمہارا
ع ۱ دین ہے اور میرے لیے میرا دین[۵]

---

[۱] اِس آیت میں چند باتیں خاص طور پر توجّہ طلب ہیں:

(۱) حکم اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہے کہ آپ کافروں سے یہ بات صاف صاف کہہ دیں، لیکن آگے کا مضمون یہ بتا رہا ہے کہ ہر مومن کو وہی بات کافروں سے کہہ دینی چاہیے جو بعد کی آیات میں بیان ہوئی ہے، حتیٰ کہ جو شخص کفر سے توبہ کرکے ایمان لے آیا ہو اس کے لیے بھی لازم ہے کہ دینِ کفر اور اس کی عبادات اور معبودوں سے اِسی طرح اپنی براءت کا اظہار کر دے۔ پس لفظِ قُل (کہہ دو) کے اوّلین مخاطَب تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، مگر یہ حکم حضورؐ کے لیے خاص نہیں ہے بلکہ آپ کے واسطے سے ہر مومن کو پہنچتا ہے۔

(۲) "کافر" کا لفظ کوئی گالی نہیں ہے جو اِس آیت کے مخاطَبوں کو دی گئی ہو، بلکہ عربی زبان میں کافر کے معنی انکار کرنے والے اور نہ ماننے والے (UNBELIEVER) کے ہیں، اور اس کے مقابلے میں "مومن" کا لفظ مان لینے اور تسلیم کر لینے والے (BELIEVER) کے لیے بولا جاتا ہے۔ لہٰذا اللہ کے حکم سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ "اے کافرو" دراصل اس معنی میں ہے کہ "اے وہ لوگو جنہوں نے میری رسالت اور میری لائی ہوئی

تعلیم کو ماننے سے انکار کر دیا ہے"۔ اور اسی طرح ایک مومن جب یہ لفظ کہے گا تو اس کی مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانے والے ہوں گے۔

(۳) اَے کافرو کہا ہے، اَے مشرکو نہیں کہا، اِس لیے مخاطب صرف مشرکین ہی نہیں ہیں بلکہ وہ سب لوگ ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا رسول، اور آپ کی لائی ہوئی تعلیم و ہدایت کو اللہ جلّ شانہٗ کی تعلیم و ہدایت نہیں مانتے، خواہ وہ یہود ہوں، نصاریٰ ہوں، مجوسی ہوں، یا دنیا بھر کے کفار و مشرکین اور ملاحدہ ہوں۔ اس خطاب کو صرف قریش یا عرب کے مشرکین تک محدود رکھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

(۴) منکرین کو اَے کافرو کہہ کر خطاب کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہم کچھ لوگوں کو اَے دشمنو، یا اَے مخالفو کہہ کر مخاطب کریں۔ اِس طرح کا خطاب دراصل مُخاطبوں کی ذات سے نہیں ہوتا بلکہ اُن کی صفتِ دشمنی اور صفتِ مخالفت کی بنا پر ہوتا ہے اور اُسی وقت تک کے لیے ہوتا ہے جب تک اُن میں یہ صفت باقی رہے۔ اگر اُن میں سے کوئی دشمنی و مخالفت چھوڑ دے، یا دوست اور حامی بن جائے تو وہ اِس خطاب کا مخاطب نہیں رہتا بالکل اِسی طرح جن لوگوں کو "اَے کافرو" کہہ کر خطاب کیا گیا ہے وہ بھی اُن کی صفتِ کُفر کے لحاظ سے ہے نہ کہ اُن کی ذاتی حیثیت سے۔ اُن میں سے جو شخص مرتے دم تک کافر رہے اُس کے لیے تو یہ خطاب دائمی ہوگا، لیکن جو شخص ایمان لے آئے وہ اِس کا مخاطب نہ رہے گا۔

(۵) مفسرین میں سے بہت سے بزرگوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اِس سورہ میں "اَے کافرو" کا خطاب قُریش کے صرف اُن چند مخصوص لوگوں سے تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دین کے معاملے میں مصالحت کی تجویزیں لے لے کر آ رہے تھے اور جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بتا دیا تھا کہ یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ یہ رائے انہوں نے دو وجوہ سے قائم کی ہے۔ ایک یہ کہ آگے لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ (جس کی یا جن کی عبادت تم کرتے ہو اس کی یا ان کی عبادت میں نہیں کرتا) فرمایا گیا ہے، اور وہ کہتے ہیں کہ یہ قول یہود و نصاریٰ پر صادق نہیں آتا، کیونکہ وہ اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ آگے یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ (اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں)، اور ان کا استدلال یہ ہے کہ یہ قول اُن لوگوں پر صادق نہیں آتا جو اِس سورہ کے نزول کے وقت کافر تھے اور بعد میں ایمان لے آئے۔ لیکن یہ دونوں دلیلیں صحیح نہیں ہیں۔ جہاں تک اِن آیتوں کا تعلق ہے اِن کی تشریح تو ہم آگے چل کر کریں گے جس سے معلوم ہو جائے گا کہ اِن کا وہ مطلب نہیں ہے جو اِن سے سمجھا گیا ہے۔ یہاں اِس استدلال کی غلطی واضح کرنے کے لیے صرف

اِتنی بات کہہ دینا کافی ہے کہ اگر اِس سُورہ کے مخاطب صرف وہی لوگ تھے تو اُن کے مرکھپ جانے کے بعد اِس سورہ کی تلاوت جاری رہنے کی آخر کیا وجہ ہے؟ اور اسے مستقل طور پر قرآن میں درج کر دینے کی کیا ضرورت تھی کہ قیامت تک مسلمان اسے پڑھتے رہیں؟

؎ اِس میں وہ سب معبود شامل ہیں جن کی عبادت دنیا بھر کے کفّار اور مشرکین کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں، خواہ وہ ملائکہ ہوں، جن ہوں، انبیاء اور اولیاء ہوں، زندہ یا مُردہ انسانوں کی ارواح ہوں، یا سُورج، چاند، ستارے، جانور، درخت، دریا، بُت اور خیالی دیویاں اور دیوتا ہوں۔ اس پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ مشرکینِ عرب اللہ تعالیٰ کو بھی تو معبود مانتے تھے اور دنیا کے دوسرے مشرکین نے بھی قدیم زمانے سے آج تک اللہ کے معبود ہونے کا انکار نہیں کیا ہے۔ رہے اہلِ کتاب تو وہ اصل معبود تو اللہ ہی کو تسلیم کرتے ہیں۔ پھر اِن سب لوگوں کے تمام معبودوں کی عبادت سے کسی استثناء کے بغیر براٴت کا اعلان کیسے صحیح ہو سکتا ہے جبکہ اللہ بھی ان میں شامل ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کو معبُودوں کے مجموعے میں ایک معبود کی حیثیت سے شامل کر کے اگر دوسروں کے ساتھ اُس کی عبادت کی جائے تو وہ شخص جو توحید پر ایمان رکھتا ہو لازماً اِس عبادت سے اپنی براءت کا اظہار کرے گا، کیونکہ اُس کے نزدیک اللہ معبودوں کے مجموعے میں سے ایک معبود نہیں، بلکہ وہی ایک تنہا معبود ہے، اور اِس مجموعے کی عبادت سرے سے اللہ کی عبادت ہی نہیں ہے اگرچہ اُس میں اللہ کی عبادت بھی شامل ہو۔ قرآن مجید میں اِس بات کو صاف صاف کہا گیا ہے کہ اللہ کی عبادت صرف وہ ہے جس کے ساتھ کسی دوسرے کی عبادت کا شائبہ تک نہ ہو، اور جس میں انسان اپنی بندگی کو بالکل اللہ ہی کے لیے خالص کر دے۔ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ حُنَفَآءَ ۔ "لوگوں کو اِس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا کہ وہ بالکل یکسُو ہو کر، اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اُس کی عبادت کریں" (البیّنہ۔ ۵)۔ یہ مضمون بکثرت مقامات پر قرآن میں پُوری وضاحت کے ساتھ اور پُورے زور کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو النساء، آیات ۱۴۵-۱۴۶- الاعراف ۲۹- الزُّمر، ۲-۳-۱۱-۱۴-۱۵- المؤمن، ۱۴-۶۴ تا ۶۶ یہی مضمون ایک حدیث قُدسی میں بیان کیا گیا ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں: "اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ مَیں سب سے بڑھ کر ہر شریک کی شرکت سے بے نیاز ہوں۔ جس شخص نے کوئی عمل ایسا کیا جس میں میرے ساتھ کسی اور کو بھی اُس نے شریک کیا ہو اُس سے مَیں بَری ہُوں اور وہ پُورا کا پُورا عمل اُسی کے لیے ہے جس کو اُس نے شریک کیا" (مُسلم، مُسند احمد، ابن ماجہ)۔ پس درحقیقت اللہ کو دو یا تین یا بہت سے خداؤں میں سے ایک قرار دینا اور اس کے ساتھ دوسروں کی بندگی و

پرستش کرنا ہی تو وہ اصل کفر ہے جس سے اظہار برأت کرنا اس سورۃ کا مقصود ہے۔

؎ اصل الفاظ ہیں مَآ اَعۡبُدُ۔ عربی زبان میں مَا کا لفظ عموماً بے جان یا بے عقل چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور ذی عقل ہستیوں کے لیے مَنۡ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اس بنا پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں مَنۡ اَعۡبُدُ کہنے کے بجائے مَآ اَعۡبُدُ کیوں کہا گیا ہے؟ اس کے چار جواب عام طور پر مفسرین نے دیئے ہیں۔ ایک یہ کہ یہاں مَا بمعنی مَنۡ ہے۔ دوسرے یہ کہ یہاں مَا بمعنی اَلَّذِیۡ (یعنی جو یا جس) ہے۔ تیسرے یہ کہ دونوں فقروں میں مَا مصدر کے معنی میں ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ میں وہ عبادت نہیں کرتا جو تم کرتے ہو، یعنی مشرکانہ عبادت، اور تم وہ عبادت نہیں کرنے جو میں کرتا ہوں، یعنی موحّدانہ عبادت۔ چوتھے یہ کہ پہلے فقرے میں چونکہ مَا تَعۡبُدُوۡنَ فرمایا گیا تھا۔ اس لیے دوسرے فقرے میں کلام کی مناسبت برقرار رکھتے ہوئے مَآ اَعۡبُدُ فرمایا گیا ہے، لیکن دونوں جگہ صرف لفظ کی یکسانی ہے، معنی کی یکسانی نہیں ہے، اور اس کی مثالیں قرآن مجید میں دوسری جگہ بھی ملتی ہیں۔ مثلاً سورۂ بقرہ (آیت ۱۹۴) میں فرمایا گیا ہے فَمَنِ اعۡتَدٰی عَلَیۡکُمۡ فَاعۡتَدُوۡا عَلَیۡہِ بِمِثۡلِ مَا اعۡتَدٰی عَلَیۡکُمۡ، "جو تم پر زیادتی کرے اس پر تم ویسی ہی زیادتی کرو جیسی اس نے تم پر کی ہے۔" ظاہر ہے کہ زیادتی کا ویسا ہی جواب جیسی زیادتی کی گئی ہو، زیادتی کی تعریف میں نہیں آتا، مگر محض کلام کی یکسانی کے لیے جواباً زیادتی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح سورۂ توبہ (آیت ۶۷) میں ارشاد ہوا ہے نَسُوا اللّٰہَ فَنَسِیَہُمۡ "وہ اللہ کو بھول گئے تو اللہ اُن کو بھول گیا"، حالانکہ اللہ بھولتا نہیں ہے اور مقصودِ کلام یہ ہے کہ اللہ نے ان کو نظر انداز فرما دیا، لیکن اُن کے نسیان کے جواب میں اللہ کے لیے نسیان کا لفظ محض کلام کی یکسانی برقرار رکھنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

یہ چاروں تاویلات اگرچہ ایک ایک لحاظ سے درست ہیں اور عربی زبان میں یہ سب معنی لینے کی گنجائش ہے، لیکن ان میں سے کسی سے بھی وہ اصل مدعا واضح نہیں ہوتا جس کے لیے مَنۡ اَعۡبُدُ کہنے کے بجائے مَآ اَعۡبُدُ کہا گیا ہے۔ دراصل عربی زبان میں کسی شخص کے لیے جب مَنۡ کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس سے مقصود اُس کی ذات کے متعلق کچھ کہنا یا پوچھنا ہوتا ہے، اور جب مَا کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس سے مقصود اس کی صفت کے بارے میں استفسار یا اظہار خیال ہوتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے اُردو زبان میں جب ہم کسی شخص کے متعلق پوچھتے ہیں کہ یہ صاحب کون ہیں، تو مقصد اُس شخص کی ذات سے تعارف حاصل کرنا ہوتا ہے، مگر جب ہم کسی شخص کے متعلق پوچھتے ہیں کہ یہ صاحب کیا ہیں، تو اس سے یہ معلوم کرنا مقصود ہوتا ہے کہ مثلاً وہ فوج کا آدمی ہے تو فوج میں اس کا منصب کیا ہے؟ اور کسی درس گاہ سے تعلق رکھتا ہے تو اُس میں ریڈر ہے؟ لکچرر ہے؟ پروفیسر

ہے ؛ کس علم یا فن کا اُستاد ہے ؟ کیا ڈگریاں رکھتا ہے ؟ وغیرہ ۔ پس اگر اس آیت میں یہ کہا جاتا کہ لَآ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَنۡ اَعۡبُدُ ، تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ تم اُس ہستی کی عبادت کرنے والے نہیں ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں ، اور اس کے جواب میں مشرکین اور کفار یہ کہہ سکتے تھے کہ اللہ کی ہستی کو تو ہم مانتے ہیں اور اس کی عبادت بھی ہم کرتے ہیں ۔ لیکن جب یہ کہا گیا کہ لَآ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَآ اَعۡبُدُ ، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جن صفات کے معبود کی عبادت میں کرتا ہوں اُن صفات کے معبود کی عبادت کرنے والے تم نہیں ہو ۔ اور یہی وہ اصل بات ہے جس کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دین منکرینِ خدا کے سوا تمام اقسام کے کفار کے دین سے قطعی طور پر الگ ہو جاتا ہے کیونکہ آپ کا خدا اُن سب کے خدا سے بالکل مختلف ہے ۔ ان میں سے کسی کا خدا ایسا ہے جس کو چھ دن میں دنیا پیدا کرنے کے بعد ساتویں دن آرام کرنے کی ضرورت پیش آئی ، جو ربّ العالمین نہیں بلکہ ربِّ اسرائیل ہے ، جس کا ایک نسل کے لوگوں سے ایسا خاص رشتہ ہے جو دوسرے انسانوں سے نہیں ہے ، جو حضرت یعقوبؑ سے کشتی لڑتا ہے اور ان کو گرا نہیں سکتا ، جو عُزیر نامی ایک بیٹا رکھتا ہے ۔ کسی کا خدا یسوع مسیح نامی ایک اِکلوتے بیٹے کا باپ ہے اور وہ دوسروں کے گناہوں کا کفارہ بنانے کے لیے اپنے بیٹے کو صلیب پر چڑھوا دیتا ہے ۔ کسی کا خدا بیوی بچے رکھتا ہے ، مگر بیچارے کے ہاں صرف بیٹیاں ہی بیٹیاں پیدا ہوتی ہیں ۔ کسی کا خدا انسانی شکل میں روپ دھارتا ہے اور زمین پر انسانی جسم میں رہ کر انسانوں کے سے کام کرتا ہے ۔ کسی کا خدا محض واجب الوجود ، یا علت العلل یا علتِ اولیٰ (FIRST CAUSE) ہے ، کائنات کے نظام کو ایک مرتبہ حرکت دے کر الگ جا بیٹھا ہے ، اس کے بعد کائنات لگے بندھے قوانین کے مطابق خود چل رہی ہے اور انسان کا اُس سے اور اُس کا انسان سے اب کوئی تعلق نہیں ہے ۔ غرض خدا کو ماننے والے کفار بھی درحقیقت اُس خدا کو نہیں مانتے جو ساری کائنات کا ایک ہی خالق ، مالک ، مُدبّر ، منتظم اور حاکم ہے ۔ جس نے نظامِ کائنات کو صرف بنایا ہی نہیں ہے بلکہ ہر آن وہی اس کو چلا رہا ہے اور اسی کا حکم ہر وقت یہاں چل رہا ہے ۔ جو ہر عیب ، نقص ، کمزوری اور غلطی سے منزّہ ہے ۔ جو ہر تشبیہ اور تجسیم سے پاک ، ہر نظیر و مثیل سے مبرا اور ہر ساتھی اور ساجھی سے بے نیاز ہے جس کی ذات ، صفات ، اختیارات اور استحقاقِ معبودیت میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے ۔ جو اس سے بالاتر ہے کہ کوئی اس کی اولاد ہو ، یا کسی کو وہ بیٹا بنائے ، یا کسی قوم اور نسل سے اس کا کوئی خاص رشتہ ہو ۔ جس کا اپنی مخلوق کے ایک ایک فرد کے ساتھ رزّاقی اور ربوبیت اور رحمت اور نگہبانی کا براہِ راست تعلق ہے ۔ جو دُعائیں سننے والا اور اُن کا جواب دینے والا ہے ۔ جو موت اور زندگی ، نفع اور ضرر اور قسمتوں کے بناؤ اور بگاڑ کے جملہ اختیارات کا تنہا مالک ہے ۔ جو اپنی مخلوق کو صرف پالتا ہی نہیں ہے بلکہ ہر ایک کو اس کی

حیثیت اور ضرورت کے مطابق ہدایت بھی دیتا ہے جس کے ساتھ ہمارا تعلق صرف یہی نہیں ہے کہ وہ ہمارا معبود ہے اور ہم اُس کی پرستش کرتے ہیں، بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے انبیاء اور اپنی کتابوں کے ذریعہ سے ہمیں امر و نہی کے احکام دیتا ہے اور ہمارا کام اس کے احکام کی اطاعت کرنا ہے جس کے سامنے ہم اپنے اعمال کے لیے جوابدہ ہیں، جو مرنے کے بعد ہمیں دوبارہ اٹھانے والا ہے اور ہمارے اعمال کا محاسبہ کرکے جزا اور سزا دینے والا ہے۔ اِن صفات کے معبود کی عبادت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم اور اُن کی پیروی کرنے والوں کے سوا دنیا میں کوئی بھی نہیں کر رہا ہے۔ دوسرے اگر خدا کی عبادت کر بھی رہے ہیں تو اصلی اور حقیقی خدا کی نہیں بلکہ اُس خدا کی عبادت کر رہے ہیں جو اُن کا اپنا اختراع کردہ ایک خیالی خدا ہے۔

سے مفسرین میں سے ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ دونوں فقرے پہلے دو فقروں کے مضمون کی تکرار ہیں، اور یہ تکرار اس غرض کے لیے کی گئی ہے کہ اُس بات کو زیادہ پُر زور بنا دیا جائے جو پہلے دو فقروں میں کہی گئی تھی۔ لیکن بہت سے مفسّرین اِس کو تکرار نہیں مانتے بلکہ وہ کہتے ہیں کہ اِن میں ایک اور مضمون بیان کیا گیا ہے جو پہلے فقروں کے مضمون سے مختلف ہے۔ ہمارے نزدیک اِس حد تک تو اُن کی بات صحیح ہے کہ اِن فقروں میں تکرار نہیں ہے کیونکہ ان میں صرف "اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں" کا اعادہ کیا گیا ہے، اور یہ اعادہ بھی اُس معنی میں نہیں ہے جس میں یہ فقرہ پہلے کہا گیا تھا۔ مگر تکرار کی نفی کرنے کے بعد مفسّرین کے اِس گروہ نے اِن دونوں فقروں کے جو معنی بیان کیے ہیں وہ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ یہاں اِس کا موقع نہیں ہے کہ ہم اُن میں سے ہر ایک کے بیان کردہ معنی کو نقل کرکے اُس پر بحث کریں، اس لیے طولِ کلام سے بچتے ہوئے ہم صرف وہ معنی بیان کریں گے جو ہمارے نزدیک صحیح ہیں۔

پہلے فقرے میں فرمایا گیا ہے کہ "اور نہ مَیں اُن کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی عبادت تم نے کی ہے"۔ اِس کا مضمون آیت نمبر ۲ کے مضمون سے بالکل مختلف ہے جس میں فرمایا گیا تھا کہ "مَیں اُن کی عبادت نہیں کرتا جن کی عبادت تم کرتے ہو"۔ اِن دونوں باتوں میں دو حیثیتوں سے بہت بڑا فرق ہے۔ ایک یہ کہ مَیں فلاں کام نہیں کرتا یا نہیں کروں گا کہنے میں اگرچہ انکار اور پُر زور انکار ہے، لیکن اس سے بہت زیادہ زور یہ کہنے میں ہے کہ مَیں فلاں کام کرنے والا نہیں ہوں، کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایسا بُرا کام ہے جس کا ارتکاب کرنا تو درکنار اُس کا ارادہ یا خیال کرنا بھی میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ "جن کی عبادت تم کرتے ہو" کا اطلاق صرف اُن معبودوں پر ہوتا ہے جن کی عبادت کفّار اب کر رہے ہیں۔ بخلاف اس کے "جن کی عبادت تم نے کی ہے" کا

اطلاق ان سب معبودوں پر ہوتا ہے جن کی عبادت کفّار اور اُن کے آباؤ اجداد زمانۂ ماضی میں کرتے رہے ہیں۔
اب یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ مشرکین اور کفّار کے معبودوں میں ہمیشہ ردّو بدل اور حذف و اضافہ ہوتا رہا
ہے۔ مختلف زمانوں میں کفّار کے مختلف گروہ مختلف معبودوں کو پُوجتے رہے ہیں، اور سارے کافروں کے
معبود ہمیشہ اور ہر جگہ ایک ہی نہیں رہے ہیں۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ مَیں تمہارے آج کے معبُودوں
ہی سے نہیں بلکہ تمہارے آباؤ اجداد کے معبودوں سے بھی بَری ہُوں اور میرا یہ کام نہیں ہے کہ ایسے معبودوں
کی عبادت کا خیال تک اپنے دل میں لاؤں۔

رہا دوسرا فقرہ، تو اگرچہ آیت نمبر ۵ میں اُس کے الفاظ وہی ہیں جو آیت نمبر ۳ میں ہیں، لیکن دونوں جگہ
اُس کا مفہوم مختلف ہے۔ آیت نمبر ۳ میں وہ اِس فقرے کے بعد آیا ہے کہ "مَیں اُن کی عبادت نہیں کرتا جن
کی عبادت تم کرتے ہو"، اِس لیے اُس کا مطلب یہ ہے کہ "اور نہ تم اُن صفات کے معبودِ واحد کی عبادت
کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں"۔ اور آیت نمبر ۵ میں وہ اِس فقرے کے بعد آیا ہے کہ "اور نہ
مَیں اُن کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی عبادت تم نے کی ہے"، اس لیے اِس کے معنی یہ ہیں کہ "اور نہ تم اُس معبودِ
واحد کی عبادت کرنے والے بنتے نظر آتے ہو جس کی عبادت مَیں کرتا ہوں"، یا بالفاظِ دیگر میرے لیے یہ ممکن
نہیں ہے کہ جن جن کو تم نے اور تمہارے اسلاف نے پُوجا ہے اُن کا پجاری بن جاؤں، اور تم کو بہت سے معبودوں
کی بندگی چھوڑ کر ایک معبُودِ واحد کی عبادت اختیار کرنے سے جو چِڑ ہے اُس کی بنا پر تم سے یہ توقع نہیں ہے
کہ اپنی اِس غلط عبادت سے باز آجاؤ گے اور اُس کی عبادت کرنے والے بن جاؤ گے جس کی عبادت میں
کرتا ہوں۔

۵ یعنی میرا دین الگ ہے اور تمہارا دین الگ۔ مَیں تمہارے معبُودوں کا پرستار نہیں اور تم میرے
معبُود کے پرستار نہیں۔ مَیں تمہارے معبُودوں کی بندگی نہیں کر سکتا اور تم میرے معبُود کی بندگی کے لیے تیار نہیں
ہو۔ اِس لیے میرا اور تمہارا راستہ کبھی ایک نہیں ہو سکتا۔ یہ کفّار کو رواداری کا پیغام نہیں ہے، بلکہ جب تک
وہ کافر ہیں اُن سے ہمیشہ کے لیے برادت، بیزاری اور لاتعلقی کا اعلان ہے، اور اس سے مقصود اُن کو
اِس امر سے قطعی اور آخری طور پر مایوس کر دینا ہے کہ دین کے معاملے میں اللّٰہ کا رسُول اور اس پر ایمان لانے
والوں کا گروہ کبھی ان سے کوئی مصالحت کرے گا۔ یہی اعلانِ برادت اور اظہارِ بیزاری اِس سورۃ کے بعد
نازل ہونے والی مکّی سُورتوں میں پے در پے کیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ یُونس میں فرمایا: "اگر یہ تُجھے جھٹلاتے ہیں

تو کہہ دے کہ میرا عمل میرے لیے ہے اور تمہارا عمل تمہارے لیے، جو کچھ مَیں کرتا ہوں اُس کی ذمّہ داری سے تم بَری ہو اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی ذمّہ داری سے مَیں بَری ہوں" (آیت ۴۱)۔ پھر آگے چل کر اِسی سُورہ میں فرمایا: "اَے نبی، کہہ دو کہ لوگو، اگر تم میرے دین کے متعلق (ابھی تک) کسی شبہ میں ہو تو (سُن لو کہ) اللہ کے سوا تم جن کی بندگی کرتے ہو مَیں اُن کی بندگی نہیں کرتا بلکہ صرف اُس خدا کی بندگی کرتا ہوں جس کے اختیار میں تمہاری مَوت ہے" (آیت ۱۰۴)۔ سُورۂ شُعراء میں فرمایا "اَے نبی، اب اگر یہ لوگ تمہاری بات نہیں مانتے تو کہہ دو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اُس سے مَیں بری الذمّہ ہوں" (آیت ۲۱۶)۔ سُورۂ سبا میں فرمایا "اِن سے کہو جو قصور ہم نے کیا ہو اس کی باز پُرس تم سے نہ ہوگی اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی کوئی جواب طلبی ہم سے نہیں کی جائے گی۔ کہو، ہمارا رب (ایک وقت) ہمیں اور تمہیں جمع کرے گا اور ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے گا" (آیات ۲۵-۲۶)۔ سُورۂ زُمَر میں فرمایا "اِن سے کہو، اَے میری قوم کے لوگو، تم اپنی جگہ کام کیے جاؤ، مَیں اپنا کام کرتا رہوں گا۔ عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر رُسوا کُن عذاب آتا ہے اور کسے وہ سزا ملتی ہے جو ٹلنے والی نہیں" (آیات ۳۹-۴۰)۔ پھر یہی سبق مدینۂ طیّبہ میں تمام مسلمانوں کو دیا گیا کہ "تم لوگوں کے لیے ابراہیمؑ اور اُس کے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ ہے کہ اُنھوں نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا کہ ہم تم سے اور تمہارے اُن معبودوں سے، جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پُوجتے ہو، قطعی بیزار ہیں، ہم نے تم سے کفر کیا اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت ہو گئی اور بَیر پڑ گیا جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ" (الممتحنہ۔ آیت ۴)۔ قرآن مجید کی اِن پے در پے توضیحات سے اِس شبہ کی گنجائش تک نہیں رہتی کہ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے دین پر قائم رہو اور مجھے اپنے دین پر چلنے دو۔ بلکہ یہ اُسی طرح کی بات ہے جیسی سورۂ زُمَر میں فرمائی گئی ہے کہ "اَے نبی، اِن سے کہو کہ مَیں تو اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اُسی کی بندگی کروں گا، تم اُسے چھوڑ کر جس جس کی بندگی کرنا چاہو کرتے رہو" (آیت ۱۴)۔

اِس آیت سے امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ نے یہ استدلال کیا ہے کہ کافروں کے مذاہب خواہ باہم کتنے ہی مختلف ہوں، لیکن کفر بحیثیتِ مجموعی ایک ہی ملّت ہے، اس لیے یہودی عیسائی کا، اور عیسائی یہودی کا، اور اسی طرح ایک مذہب کا کافر دوسرے مذہب کے کافر کا وارث ہو سکتا ہے اگر اُن کے درمیان نسب، نکاح یا کسی سبب کی بنا پر کوئی ایسا تعلق ہو جو ایک کی وراثت دوسرے کو پہنچنے کا مقتضی ہو۔ بخلاف اس کے امام مالکؒ، امام اَوزاعی اور امام احمد اِس بات کے قائل ہیں کہ ایک مذہب کے پیرو دوسرے مذہب کے پیرو کی وراثت

نہیں پا سکتے۔ ان کا استدلال اُس حدیث سے ہے جو حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن عاص سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا یتوارث اھل ملتین شتّٰی "دو مختلف ملتوں کے لوگ ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے" (مسند احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، دارقطنی)۔ اس سے ملتے جلتے مضمون کی ایک حدیث ترمذی نے حضرت جابرؓ سے اور ابن حبان نے حضرت عبداللہ بن عمر سے اور بزار نے حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کی ہے۔ اس مسئلے پر مفصل بحث کرتے ہوئے مسلکِ حنفی کے مشہور امام شمس الائمہ سرخسی لکھتے ہیں: "کفار آپس میں اُن سب اسباب کی بنا پر بھی ایک دوسرے کے وارث ہو سکتے ہیں جن کی بنا پر مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوتے ہیں، اور اُن کے درمیان بعض ایسی صورتوں میں بھی توارُث ہو سکتا ہے جن میں مسلمانوں کے درمیان نہیں ہوتا۔ . . . . حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے بس دو ہی دین قرار دیئے ہیں، ایک دینِ حق، دوسرے دینِ باطل، چنانچہ فرمایا لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ۔ اور اس نے لوگوں کے دو ہی فریق رکھے ہیں، ایک فریق جنتی ہے اور وہ مومن ہے اور دوسرا فریق دوزخی ہے اور وہ بحیثیتِ مجموعی تمام کفار ہیں۔ اور اُس نے دو ہی گروہوں کو ایک دوسرے کا مخالف قرار دیا ہے، چنانچہ فرمایا هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ (یہ دو مدِمقابل فریق ہیں جن کے درمیان اپنے رب کے معاملے میں جھگڑا ہے۔ الحج، آیت ۱۹) یعنی ایک فریق تمام کفار بحیثیت مجموعی ہیں اور ان کا جھگڑا اہل ایمان سے ہے . . . . ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ وہ اپنے اعتقاد کے مطابق باہم الگ الگ ملتیں ہیں، بلکہ مسلمانوں کے مقابلے میں وہ سب ایک ہی ملت ہیں، کیونکہ مسلمان محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآن کا اقرار کرتے ہیں، اور وہ اس کا انکار کرتے ہیں اسی وجہ سے وہ کافر قرار پاتے ہیں اور مسلمانوں کے معاملہ میں وہ سب ایک ملت ہیں . . . . حدیث لا یتوارث اھل ملتین اسی بات کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے، کیونکہ مِلَّتَیْن (دو ملتوں) کی تشریح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد سے کر دی ہے کہ لا یرث المسلم الکافر ولا الکافر المسلم، مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو سکتا اور نہ کافر مسلمان کا وارث ہو سکتا ہے" (المبسوط، ج ۳۰، صفحات ۳۰-۳۲)۔ امام سرخسی نے یہاں جس حدیث کا حوالہ دیا ہے اسے بخاری، مسلم، نسائی، احمد، ترمذی، ابن ماجہ اور ابوداؤد نے حضرت اُسامہؓ بن زید سے روایت کیا ہے۔

تفہیم القرآن

النّصر

نام پہلی آیت اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ کے لفظ نصر کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول حضرت عبداللہؓ بن عباس کا بیان ہے کہ یہ قرآن مجید کی آخری سورت ہے، یعنی اس کے بعد کوئی مکمل سورت حضورؐ پر نازل نہیں ہوئی[1] (مسلم، نسائی، طبرانی، ابن ابی شیبہ، ابن مَردُوْیہ) حضرت

---

[1] مختلف روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد بعض آیات نازل ہوئی ہیں لیکن اس امر میں اختلاف ہے کہ قرآن کی وہ آیت کونسی ہے جو حضورؐ پر سب سے آخر میں نازل ہوئی۔ بخاری و مسلم میں حضرت براءؓ بن عازب کی روایت یہ ہے کہ سورۂ نساء کی آخری آیت یَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْكُمْ فِی الْكَلٰلَةِ ہے۔ امام بخاریؒ نے ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ آیتِ ربٰو یعنی جس آیت میں سُود کی حُرمت کا حکم دیا گیا ہے، قرآن کی سب سے آخری آیت ہے۔ اس کی تائید اُن روایات سے بھی ہوتی ہے جو امام احمد، ابنِ ماجہ اور ابنِ مَردُوْیہ نے حضرت عمرؓ سے نقل کی ہیں، مگر اُن میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ یہ آخری آیت ہے، بلکہ حضرت عُمرؓ کا قول یہ ہے کہ یہ سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیات میں سے ہے۔ ابوعُبَید نے فضائل القرآن میں امام زُہری کا، اور ابن جریر نے اپنی تفسیر میں حضرت سعید بن المُسَیَّب کا قول نقل کیا ہے کہ آیتِ ربٰو اور آیتِ دَین (یعنی سُورۂ بقرہ رکوع ۳۸ و ۳۹) قرآن میں نازل ہونے والی آخری آیات ہیں۔ نسائی، ابن مَردُوْیہ اور ابن جریر نے حضرت عبداللہ بن عباس کا ایک دوسرا قول نقل کیا ہے کہ وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ (البقرہ، ۲۸۱) قرآن کی آخری آیت ہے۔ الفِریابی نے اپنی تفسیر میں ابن عباسؓ کا جو قول نقل کیا ہے اس میں یہ اضافہ ہے کہ یہ آیت حضورؐ کی وفات سے ۸۱ دن پہلے نازل ہوئی تھی، اور سعید بن جُبیر کا قول جو ابن ابی حاتم نے نقل کیا ہے اس میں اس آیت کے نزول اور حضورؐ کی وفات کے درمیان صرف ۹ دن کا فصل بیان کیا گیا ہے۔ امام احمد کی مُسند اور امام حاکم کی المُستدرک میں اُبَیؓ بن کعب کی روایت یہ ہے کہ سُورۂ توبہ کی آیات ۱۲۸ - ۱۲۹ سب سے آخر میں نازل ہوئی ہیں۔

عبداللہؓ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ یہ سورت حجۃ الوداع کے موقع پر ایامِ تشریق کے وسط میں بمقام منیٰ نازل ہوئی اور اس کے بعد حضورؐ نے اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر اپنا مشہور خطبہ ارشاد فرمایا (ترمذی، بزار، بیہقی، ابن ابی شیبہ، عبد بن حُمید، ابویعلیٰ، ابن مَردُویہ)۔ بیہقی نے کتاب الحج میں حضرت سَراءؓ بنت نبہان کی روایت سے حضور کا وہ خطبہ نقل کیا ہے جو آپ نے اس موقع پر ارشاد فرمایا تھا۔ وہ کہتی ہیں کہ:-

"میں نے حجۃ الوداع میں حضورؐ کو یہ فرماتے سُنا کہ لوگو، جانتے ہو کہ یہ کونسا دن ہے؟ لوگوں نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے۔ فرمایا یہ ایامِ تشریق کے بیچ کا دن ہے۔ پھر آپ نے پوچھا جانتے ہو یہ کونسا مقام ہے؟ لوگوں نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے۔ فرمایا یہ مَشعَرِ حرام ہے۔ پھر حضورؐ نے فرمایا کہ میں نہیں جانتا، شاید اس کے بعد میں تم سے نہ مل سکوں۔ خبردار رہو، تمہارے خون اور تمہاری عزتیں ایک دوسرے پر اُسی طرح حرام ہیں جس طرح یہ دن اور یہ مقام حرام ہے، یہاں تک کہ تم اپنے رب کے سامنے حاضر ہو اور وہ تم سے تمہارے اعمال کے بارے میں سوال کرے۔ سُنو، یہ بات تم میں سے قریب والا دُور والے تک پہنچا دے۔ سنو، کیا میں نے تمہیں پہنچا دیا؟ اس کے بعد جب ہم لوگ مدینہ واپس ہوئے تو کچھ زیادہ دن نہ گذرے تھے کہ حضورؐ کا انتقال ہو گیا۔"

اِن دونوں روایتوں کو ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سُورۂ نصر کے نزول اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی وفات کے درمیان ۳ مہینے کچھ دن کا فصل تھا، کیونکہ تاریخ کی رُو سے حجۃ الوداع اور حضورؐ کے وِصال کے درمیان اتنا ہی زمانہ گزرا تھا۔

ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ جب یہ سُورہ نازل ہوئی تو حضورؐ نے فرمایا مجھے میری وفات کی خبر دے دی گئی ہے اور میرا وقت آن پُورا ہوا (مُسند احمد، ابنِ جریر، ابن المنذر، ابن مَردُویہ)۔ دوسری روایات جو حضرت عبداللہ بن عباس سے منقول ہوئی ہیں اُن میں بیان کیا گیا ہے کہ اِس سُورۃ کے نزول سے حضورؐ نے یہ سمجھ لیا تھا کہ آپ کو دنیا سے رخصت ہونے کی اطلاع دے دی گئی ہے (مُسند احمد، ابن جریر، طبرانی، نسائی، ابن ابی حاتم، ابن مردُویہ)۔

ام المومنین حضرت امّ حبیبہؓ فرماتی ہیں کہ جب یہ سُورۃ نازل ہوئی تو حضورؐ نے فرمایا اِس سال میرا انتقال ہونے والا ہے۔ یہ بات سُن کر حضرت فاطمہؓ رو دیں۔ اِس پر آپؐ نے فرمایا میرے

خاندان میں سے تم ہی سب سے پہلے مجھ سے آ کر ملو گی۔ یہ سُن کر وہ ہنس دیں (ابن ابی حاتم۔ ابنِ مَردُوْیہ)۔ قریب قریب اِسی مضمون کی روایت بَیْہقی نے ابن عباس سے نقل کی ہے۔

ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مجھے غَزوۂ بدر میں شریک ہونے والے بڑے بڑے شیوخ کے ساتھ اپنی مجلس میں بُلاتے تھے۔ یہ بات بعض بزرگوں کو ناگوار گزری اور انہوں نے کہا کہ ہمارے لڑکے بھی تو اِسی لڑکے جیسے ہیں، اِس کو خاص طور پر کیوں ہمارے ساتھ شریکِ مجلس کیا جاتا ہے؟ (امام بخاری اور ابن جریر نے تصریح کی ہے کہ یہ بات کہنے والے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف تھے)۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ علم کے لحاظ سے اِس کا جو مقام ہے وہ آپ لوگ جانتے ہیں۔ پھر ایک روز انہوں نے شیوخ بدر کو بلایا اور مجھے بھی اُن کے ساتھ بُلا لیا۔ میں سمجھ گیا کہ آج مجھے یہ دکھانے کے لیے بلایا گیا ہے کہ مجھ کو ان کی مجلس میں کیوں شریک کیا جاتا ہے۔ دورانِ گفتگو میں حضرت عمرؓ نے شیوخِ بدر سے پوچھا کہ آپ حضرات اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَالۡفَتۡحُ کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ بعض نے کہا اس میں ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ جب اللہ کی نصرت آئے اور ہم کو فتح نصیب ہو تو ہم اللہ کی حمد اور اس سے استغفار کریں۔ بعض نے کہا اس سے مراد شہروں اور قلعوں کی فتح ہے۔ بعض خاموش رہے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے کہا ابن عباس، کیا تم بھی یہی کہتے ہو؟ مَیں نے کہا، نہیں۔ انہوں نے پوچھا پھر تم کیا کہتے ہو؟ مَیں نے عرض کیا اس سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجل ہے۔ اِس میں حضورؐ کو خبر دی گئی ہے کہ جب اللہ کی نصرت آجائے اور فتح نصیب ہو جائے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا وقت آن پورا ہوا، اِس کے بعد آپ اللہ کی حمد اور استغفار کریں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا میں بھی اُس کے سوا کچھ نہیں جانتا جو تم نے کہا ہے۔ ایک روایت میں اس پر یہ اضافہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے شیوخِ بدر سے فرمایا آپ لوگ مجھے کیسے ملامت کرتے ہیں جبکہ اِس لڑکے کو اِس مجلس میں شریک کرنے کی وجہ آپ نے دیکھ لی (بخاری، مُسند احمد، تِرمذی، ابن جریر، ابنِ مَردُوْیہ، بَغَوی، بَیْہقی، ابن المُنذِر)۔

موضوع اور مضمون جیسا کہ مندرجۂ بالا روایات سے معلوم ہوتا ہے، اِس سُورہ میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتا دیا تھا کہ جب عرب میں اسلام کی فتح مکمل ہو جائے اور لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہونے لگیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ کام مکمل ہو گیا جس کے لیے آپ دنیا میں بھیجے گئے تھے۔ اس کے بعد آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ اللہ کی حمد اور اس کی تسبیح کرنے میں مشغول ہو

جائیں کہ اُس کے فضل سے آپ اتنا بڑا کام انجام دینے میں کامیاب ہوئے، اور اُس سے دُعا کریں کہ اِس خدمت کی انجام دہی میں جو بُھول چُوک یا کوتاہی بھی آپ سے ہوئی ہو اُسے وہ معاف فرما دے۔ اِس مقام پر آدمی غور کرے تو دیکھ سکتا ہے کہ ایک نبی اور ایک عام دنیوی رہنما کے درمیان کتنا عظیم فرق ہے۔ کسی دنیوی رہنما کو اگر اپنی زندگی ہی میں وہ انقلابِ عظیم برپا کرنے میں کامیابی نصیب ہو جائے جس کے لیے وہ کام کرنے اٹھا ہو تو اس کے لیے یہ جشن منانے اور اپنی قیادت پر فخر کرنے کا موقع ہوتا ہے۔ لیکن یہاں اللہ کے پیغمبر کو ہم دیکھتے ہیں کہ اُس نے ۲۳ سال کی مختصر مدت میں ایک پُوری قوم کے عقائد، افکار، عادات، اخلاق، تمدّن، تہذیب، معاشرت، معیشت، سیاست اور حربی قابلیت کو بالکل بدل ڈالا اور جہالت و جاہلیت میں ڈوبی ہوئی قوم کو اُٹھا کر اِس قابل بنا دیا کہ وہ دنیا کو مسخر کر ڈالے اور اقوامِ عالم کی امام بن جائے، مگر ایسا عظیم کارنامہ اس کے ہاتھوں انجام پانے کے بعد اُسے جشن منانے کا نہیں بلکہ اللہ کی حمد اور تسبیح کرنے اور اُس سے مغفرت کی دُعا کرنے کا حکم دیا جاتا ہے، اور وہ پُوری عاجزی کے ساتھ اِس حکم کی تعمیل میں لگ جاتا ہے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات سے پہلے سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ، أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ (بعض روایات میں الفاظ یہ ہیں سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ، أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَأَتُوبُ إِلَيْهِ) کثرت سے پڑھا کرتے تھے۔ مَیں نے عرض کیا یا رسُول اللہ یہ کیسے کلمات ہیں جو آپ نے اب پڑھنے شروع کر دیے ہیں؟ فرمایا میرے لیے ایک علامت مقرر کر دی گئی ہے کہ جب میں اُسے دیکھوں تو یہ الفاظ کہا کروں اور وہ ہے إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ (مسند احمد، مسلم، ابن جریر، ابن المُنذر، ابن مردویہ)۔ اِسی سے ملتی جُلتی بعض روایات میں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ آپؐ اپنے رکُوع و سجود میں بکثرت یہ الفاظ کہتے تھے سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ، اللّٰهُمَّ اغْفِرْلِي۔ یہ قرآن (یعنی سُورۂ نصر) کی تاویل تھی جو آپؐ نے فرمائی تھی (بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ابنِ ماجہ، ابنِ جریر)۔

حضرت اُمّ سلمہ فرماتی ہیں کہ رسولؐ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک پر آپؐ کے آخری زمانۂ حیات میں اُٹھتے بیٹھتے اور جاتے آتے یہ الفاظ جاری رہتے: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ۔ مَیں نے ایک روز پُوچھا کہ یا رسول اللہ، آپ کثرت سے یہ ذکر کیوں کرتے رہتے ہیں؟ فرمایا مجھے اِس کا حکم دیا گیا ہے۔

پھر آپ نے یہ سورۃ پڑھی (ابن جریر)۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ جب یہ سورۃ نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کثرت سے یہ ذکر فرماتے رہتے: سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ، سُبْحَانَكَ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الْغَفُوْرُ (ابن جریر، مُسند احمد، ابن ابی حاتم)۔

ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ اس سورت کے نازل ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخرت کے لیے محنت و ریاضت کرنے میں اس قدر شدت کے ساتھ مشغول ہو گئے جتنے اس سے پہلے کبھی نہ ہوئے تھے (نسائی، طبرانی، ابن ابی حاتم، ابن مَردُویہ)

تصحیح اغلاط

تفہیم القرآن جلد سوم میں حسبِ ذیل مقامات کی اصلاح کر لی جائے:

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۸۲	۴	بِھنک	بِھنک
۹۲	۷	ہمیشہ میرے	ہمیشہ ہمارے
۳۴۶	۳-۴	پھر آپ نے وہ لفظ استعمال کیا جو عربی زبان میں خاص فعلِ مباشرت کے لیے بولا جاتا ہے اور یہ فحش لفظ	پھر آپ نے وہ لفظ استعمال کیا جو عربی زبان میں صریحاً فعلِ مباشرت ہی کے لیے بولا جاتا ہے اور فحش سمجھا جاتا ہے ایسا لفظ
۴۲۷	۸-۹	جس روز تم اس کی طرف پلٹو گے وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کچھ کر کے آتے ہو	جس روز لوگ اُس کی طرف پلٹیں گے وہ انہیں بتا دے گا کہ وہ کیا کچھ کر کے آتے ہیں۔

تفہیم القرآن جلد پنجم میں حسبِ ذیل مقام کی اصلاح کر لی جائے:

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۹	۱۳-۱۴	حضرت عمرؓ تو اس پر نوافل اور صدقات ادا کرتے رہتے تاکہ اللہ تعالیٰ اس گستاخی کو معاف فرمائے جو اُس روز اُن سے شانِ رسالتؐ میں ہو گئی تھی۔	حضرت عمرؓ تو اُس گفتگو پر نادم رہے جو اُنہوں نے اُس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کی تھی اور صدقات و نوافل ادا کرتے رہے تاکہ اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمائے۔

جبر و قدر کے درمیان انسانی راہِ عمل

از جناب نعیم صدیقی صاحب

(۲)

پچھلی قسط اُس جواب پر مشتمل تھی جو مَیں نے ایک صاحب کے سوال پر لکھا تھا۔ اب چونکہ یہ تحریر ترجمان القرآن میں شائع کی جا رہی ہے، اس لیے مزید دو ایک نکات کا اضافہ کر رہا ہوں جنہیں مسئلہ کو سمجھنے کے لیے سامنے رکھنا ضروری ہے۔

(۱) خدا نے اپنے علمِ پیشیں اور علمِ بعد از وقوعِ اعمال و حادثات میں خود ہی فرق کیا ہے۔

قرآن میں جہاں کہیں اس طرح کے ارشادات آتے ہیں کہ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَ لِيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ۔ (اور تاکہ اللہ تم میں ایسے لوگوں کو جان لے — یا دیکھ لے — جو جہاد کرنے والے ہیں، اور جو صبر کرنے والے ہیں)۔ یا مثلاً یہ ارشاد کہ لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ (اللہ خبیث عنصر کو طیب عنصر سے الگ چھانٹ دے)، یا فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (وہ تمہیں دیکھے کہ تم عملاً کیا رویّہ اختیار کرتے ہو)۔ اِن آیات کو سامنے رکھیں تو پوری بات نہ سمجھنے والے قاری کو اُلجھن ہو گی کہ آخر اللہ تعالیٰ جب غیب داں اور عالمِ احوالِ دوش و فردا ہے تو پھر اُسے دیکھنے، جاننے اور اہلِ خیر و شر کے چھنٹ کر الگ ہو جانے کا انتظار کیوں ہے؟

بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے علمِ پیشیں کی بنیاد پر کوئی حکم اور کوئی جزا و سزا انسان کے اُن اعمال پر وارد نہیں کرتا جو انسان اپنے محدود دائرۂ اختیار میں کرتا ہے، بلکہ وہ اس کی نیتوں، ارادوں، جذبات، خواہشات، افکار، منصوبوں اور اخلاقی اصولوں کے ظہور اور پیرایۂ عمل میں ان کے رُونما ہونے کے بعد اپنے قوانین و نوامیس کے تحت دنیا و آخرت کے لیے فیصلے صادر کرتا ہے۔

گویا انسانی ذمہ داری کے دائرے میں اعمال کے وقوع پذیر ہونے کے بعد کے علم پر احکام اور فیصلے صادر

ہوتے ہیں (اگرچہ خدا کے علمِ پیشیں اور علمِ بعد از صُدورِ اعمال و واقعات میں کوئی تضاد نہیں ہوتا)۔ جزا و سزا کا اِجرا اور اقوام و ملل کے عروج و زوال کے فیصلے علمِ بعد از وقوعِ اعمال و واقعات پر مبنی ہوتے ہیں۔

عدالتِ آخرت میں بھی کوئی فیصلہ اللہ تعالیٰ اپنے علمِ پیشیں کی بنیاد پر صادر نہیں فرمائے گا، بلکہ محض اپنے ذاتی علمِ بعد از وقوعِ اعمال و واقعات پر بھی نہیں ـــ وہاں تو ہر معاملے کا باقاعدہ تحریری ریکارڈ سامنے لایا جائے گا، اُس کی بنا پر مقدمات قائم ہونگے، سوالات کیے جائیں گے، انسان کے سامنے اس کے زندگی بھر کے کردار کے متعلق خارجی اور داخلی شہادتیں لائی جائیں گی، اس کے سینے کے مخفی اَسرار، اس کے قلب کے پوشیدہ عزائم، اور اس کے ذہن کی تہ در تہ کیفیتیں ساری اس کے سامنے فاش کر کے رکھ دی جائیں گی۔ اُس دن آدمی اپنے آپ کو پُوری طرح جانے گا کہ وہ کیا تھا اور کن پردوں میں اس نے اپنے آپ کو دوسروں سے چھپائے رکھا، اور کن خود فریبیوں سے اپنی حقیقت سے خود بھی آنکھیں چُرائیں۔

عدالتِ آخرت کے سارے مقدمات علمِ بعد از وقوعِ افعال اور پھر اُن اعمال کی شہادتوں کے ریکارڈ پر مبنی ہوں گے۔

(۲) تمام موجودات کی طرح انسانی افراد اور اقوام اور حکومتوں اور تحریکوں سب کے لیے خدا کے ہاں ایک اجلِ مسمّٰی قرار پاتی ہے۔ اقوام کو اس نامعلوم اجلِ مسمّٰی تک (جو اللہ کے علم میں ہوتی ہے) مہلتِ کار یا رخصتِ عمل دی جاتی ہے اور اسے اقتدار یا ترقی کا موقع عطا کیا جاتا ہے۔ افراد کے لیے یہ مہلت زیادہ سے زیادہ طبعی عمر تک ہو سکتی ہے، اور اقوام کے لیے امکانی صورت میں یہ قیامت تک کے لیے بھی ہو سکتی ہے۔

لیکن ضروری نہیں کہ افراد یا اقوام لازماً اُس اجلِ مسمّٰی تک ضرور پہنچیں جس کی گنجائش ان کے لیے رکھی گئی ہے۔ بلکہ جس طرح افراد جسمانی صحت کی تباہی کے وجوہ و عوامل کے شکار ہو کر وقت سے پہلے اپنا دورِ عمر ختم کر لیتے ہیں، اسی طرح اقوام اپنے غلط اخلاقی رویّوں سے اللہ کی عطا کردہ "زیادہ سے زیادہ" مہلتِ کار یا رخصتِ عروج و اقتدار سے استفادہ کرنے سے محروم ہو جاتی ہیں اور ان کے لیے اجلِ مسمّٰی کا جو نشان مستقبل میں دُور کسی مقام پر لگا ہوتا ہے، اسے وہاں سے اٹھا کر مشیتِ الٰہی پیچھے لے آتی ہے۔ یہ بات کہتے ہوتے میرے سامنے وہ آیات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے اقوام کو راست روی کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا کہ یُؤَخِّرْکُمْ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی (تاکہ وہ تم کو زیادہ سے زیادہ مہلت کی آخری حد تک زندہ رہنے، یا برسرِ اقتدار رہنے یا پھلنے پھولنے اور اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کا موقع دے)۔ اس موقع کو ضائع

کر دینے والی اقوام کو ایسے عالم میں یکدم (بَغْتَۃً) دبوچ لیا جاتا ہے جب کہ وہ اپنی قوت، ترقی اور کامیابی پر جھوم رہی ہوتی ہیں یا عیش و تنعم میں مگن ہوتی ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ اگر اجل مسمّٰی غلط عملی روش کی وجہ سے پیچھے آسکتی ہے، تو صحیح رویے کی صورت میں وہ آگے بھی بڑھ سکتی ہے۔

اگرچہ ہر فرد و قوم کے متعلق اللہ تعالیٰ کے علم پیشیں میں یہ قطعی معلومات موجود ہیں کہ فلاں شخص اور فلاں گروہ خدا کی طرف سے دی گئی زیادہ سے زیادہ مہلت کی آخری حد تک جائے گا یا نہیں، اور کون اپنی اجلِ مسمّٰی کو اپنے اعمال کی وجہ سے قریب لے آئے گا، اور کون اسے آگے دُور تک بڑھوائے گا، لیکن افراد و اقوام کو دیے جانے والے نتائج اللہ اپنے علم پیشیں کے بل پر نہیں دیتا، بلکہ ان کے اعمال نیک و بد کے صدور کے بعد دیتا ہے۔

(۳) اس سلسلے میں توضیح کے لیے اگر قومِ یونس کی مثال کو سامنے رکھا جائے تو خاصی روشنی مل سکتی ہے۔ اس قوم میں ایک مرحلے پر بگاڑ اس حد تک آپہنچا تھا کہ خدا کی ناراضگی حضرت یونسؑ کے قلب پر واضح ہو گئی تھی، اور انھوں نے نگاہِ نبوت سے دیکھ لیا تھا کہ ان کی قوم پر عذاب کی تلوار بالکل لٹک گئی ہے۔ چنانچہ وہ مُعذّب ہونے والی قوم کو باقاعدہ اذنِ الٰہی سے پہلے ہی چھوڑ کر الگ ہو گئے۔

دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہیں گے کہ قومِ یونس اس وقت اپنی اجل مسمّٰی کو بالکل قریب لے آئی تھی۔ لیکن قرآن نے اس قوم کی یہ واحد مثال ہمارے سامنے رکھی ہے کہ ایسی شدید بداعمالیوں میں مبتلا ہونے کے بعد جو عذاب کو دعوت دینے والی تھیں، یکایک وہ اپنی گمراہی اور پستی کا احساس کر لیتی ہے اور خدا کے آنے والے عذاب سے خوف زدہ ہو کر آخری مرحلے میں توبہ و انابت کی راہ اختیار کر لیتی ہے جس کی توقع حضرت یونسؑ کو نہ تھی۔ اس توبہ و انابت کے ذریعے قومِ یونس نے ہاتھ سے جاتی ہوتی مہلتِ کار کو دوبارہ حاصل کر لیا، اور اس کی اجل مسمّٰی کا سنگِ میل یک دم دُور ہٹا کر فاصلہ بڑھا دیا گیا۔

اسی طرح قوم یہود کے احوال کا مطالعہ کرتے ہوئے اگر اس طرزِ معاملہ پر غور کیا جائے جو مختلف مراحل میں خدا نے ان سے روا رکھا تو عرض کردہ حقیقت بہت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ان کی طرف سے دو بڑے ادوارِ فساد کے ظہور کا ذکر ہے، جن کے متعلق انہیں وارننگ دی جاتی ہے۔ مگر یہ قوم دونوں دفعہ وجہِ فساد بنتی ہے اور دونوں دفعہ ایسی کڑی سزا پاتی ہے کہ بظاہر دوبارہ سر اٹھانا ممکن نہیں

نظر آتا۔ لیکن چونکہ مار کھانے کے بعد اس میں پھر رجوع الی اللہ پیدا ہوتا ہے، اس لیے اسے پھر خدا کی طرف سے مدد دے کر از سرِ نو مہلت کارِ دی جاتی ہے۔ اسی سلسلے میں آتا ہے وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ (اور اگر تم پھر ایسا ہی کرو گے تو ہم بھی تمہارے ساتھ ویسا ہی سلوک کریں گے)۔

(۴) ایک نہایت قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ اپنے قرآنی پیغامِ ہدایت میں خدا تعالیٰ نے انسان کو ایک آزاد و ذی شعور مخلوق کی حیثیت سے اپنے دین کے کام میں حصہ لینے کے لیے پکارا ہے۔ مثلاً یہ ارشاد کہ کُوْنُوْا اَنْصَارَ اللّٰہِ (اللہ کے مددگار بنو)۔ یا یہ اندازِ کلام کہ اَقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا (اللہ کو قرضِ حسن دو)۔ یا یہ کہ کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ (انصاف کی علمبرداری کے لیے کھڑے ہونے والے بنو)۔

ظاہر بات ہے کہ اگر انسان کو دینی اور اخلاقی مسلک پر چلانے کے لیے جبریت کا طریقہ کارفرما ہوتا تو اسے پکارنے اور اس میں رضاکارانہ جذبہ یا آزاد ارادہ ابھارنے کی ضرورت نہ ہوتی۔

(۵) جبر و اختیار سے مرکّب زندگی کو سمجھنے کے لیے ایک مثال مدد دے سکتی ہے۔ ایک شخص کی ملکیت میں ایک موٹر گاڑی بھی ہے اور اس کی غلامی یا ملازمت میں ایک ڈرائیور بھی ہے۔ اب مکمل جبریت کا وہ مقام بالکل الگ سمجھ میں آسکتا ہے جو موٹر گاڑی کا ہے۔ موٹر گاڑی کے پرزے اس طرح جوڑ دیئے گئے ہیں کہ وہ کسی صاحبِ دماغ ڈرائیور کے ہاتھوں مقررہ طریقے کے ساتھ چل سکتی ہے اور رُک سکتی ہے۔ مگر موٹر کار کے ساتھ دماغ اور ارادہ موجود نہیں۔ وہ نہ بطورِ خود سمجھ سوچتی ہے، نہ دو راستوں میں سے کسی کا انتخاب کرتی ہے، اور نہ اس سے کسی غلطی یا گناہ یا خلاف ورزیِ قانون کا صدور ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے ڈرائیور اگرچہ غلامی یا ملازمت کے بندھن میں بندھا ہوا ہے، وہ کفالت یا تنخواہ یا اُجرت کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے، اسے مختلف راستوں اور سڑکوں میں سے منزلِ مقصود کی طرف جانے کے لیے جگہ جگہ کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوتا ہے اور وہ حسبِ ضرورت موڑ کاٹتا ہے۔ اُسے سڑک پر نصب شدہ نشانات اور انتباہی اشارات کا بھی لحاظ رکھنا ہوتا ہے۔ وہ گاڑی چلانے میں مالک کی مرضی کے خلاف غفلت سے بھی اور دانستہ بغاوت و انحراف کے جذبے سے بھی، اور اپنے کسی محدود وقتی فائدے کی ہوس میں آکر بھی غلط طریق پر سوچ سکتا ہے، غلط ارادہ کر سکتا ہے، اور غلط رُخ پر یا غلط طریق سے گاڑی چلا کر یا تو کسی حادثے سے دوچار ہو سکتا ہے یا مالک کی ناراضگی مول لے سکتا ہے کیونکہ موٹر گاڑی کے بخلاف اسے دماغ اور قوتِ ارادی اور قوتِ فیصلہ حاصل ہے۔ اس کے ساتھ جذبات اور خواہشات موجود ہیں، اور وہ سمع و بصر سے آراستہ ہے۔

موٹر گاڑی، انجینئر یا مالک کی مرضی پر بنے ہوئے نقشے سے انحراف نہیں کر سکتی۔ ڈرائیور اپنی مرضی ہی سے چاہے تو مالک کے احکام کی پابندی کرے، اور اس رویّے کا اچھا نتیجہ حاصل کرے، اور چاہے تو وہ ان احکام کی تعمیل میں گڑبڑ کرے یا مکمل بغاوت کا رویہ اختیار کرے، اور پھر اس رویّے کا بُرا خمیازہ بھگتے۔

مسئلہ جبر و قدر میں اُلجھنے والے حضرات بالعموم انسان کو موٹر گاڑی کی سی پوزیشن دیتے ہیں جو فی الحقیقت خدا نے طبعی نظام میں کسی ہوئی کائنات کو دی ہے۔ حالانکہ وہ ایک پرورش کنندہ مالک کی غلامی میں کام کرنے والے ذی شعور و ذی ارادہ ڈرائیور کی حیثیت رکھتا ہے۔

مالک اپنے ڈرائیور کو ہدایات دیتا ہے، اسے پروگرام بتاتا ہے، اسے جادۂ سفر تجویز کر کے بتا دیتا ہے کہ فلاں سمت میں جانا ہے اور فلاں دوراہے پر یا چوراہے پر فلاں جانب مڑنا ہے اور فلاں فلاں اطراف میں بڑھنے سے اجتناب کرنا ہے۔ ایسی ہدایات موٹر کار کو نہیں دی جاتیں۔ وہ تو بے بس آلۂ کار ہے۔ انسان ایسا سو فیصدی بے بس آلۂ کار نہیں ہے۔

(۶) تاریخ میں بے شمار واقعات ایسے سامنے آتے ہیں جنہیں تاریخ کے "اگر مگر" IFS AND BUTS OF HISTORY سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی اگر فلاں معاملے میں فلاں صورتِ حالات نہ پیدا ہو جاتی تو نتیجہ وہ نہ نکلتا جو نکلا۔

کسان فصل بوتا ہے، اسے پروان چڑھانے کے لیے دن رات محنت کرتا ہے۔ مگر بارش وقت پر نہیں ہوتی، اولے برس جاتے ہیں، گرم زہریلی ہوا چل جاتی ہے، فصل تباہ ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف کسی اور موقع پر کسان نے سرسری کام کیا ہے مگر موسمی حالات کی سازگاری نے بہت اچھا نتیجہ پیدا کر دیا۔

جنگِ خندق کے موقع پر ایسی شدید آندھی چلتی ہے کہ مدینہ پر حملہ آور ہونے والے لشکرِ جرّار کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور سارے عرب سے جمع شدہ یہ قوت مقصد حاصل کیے بغیر بکھر کر واپس چلی جاتی ہے۔

یہ سب کیا ہے؟

بات یہ ہے کہ افراد کی زندگی میں بھی اور اقوام اور تحریکوں کی زندگی میں بھی انسانی سعی و جہد پر بہت بڑا اثر ایسے احوال و ظروف ڈالتے ہیں جن کے کسی خاص وقت پر پیدا کرنے میں انسان کا اپنا دخل یا تو بالکل نہیں ہوتا، یا نہایت ہی برائے نام اور غیر مؤثر ہوتا ہے۔ یہ احوال و ظروف مشیتی نظام سے تعلق رکھتے ہیں۔ کسی شخص یا قوم کو کیا قدرتی وسائل ملے؟ کیسی ذہنی و جسمانی صلاحیتِ کار ملی؟ کب کدھر سے کونسی دشمن یا دوست قوتیں اُبھر آئیں؟

کب کس سے تصادم پیش آیا؟ اس تصادم میں قدرتی اور بین الاقوامی احوال کس طرح اثر انداز ہوئے؟ اقتصادی ترقی کے لیے کبھی یکایک نئے معدنی، کیمیادی یا سائنسی تحقیق کے ذریعے منکشف ہونے والے وسائل ہاتھ آجاتے ہیں۔ کبھی تجارتی عروج کے لیے بین الاقوامی منڈیوں میں کوئی سازگار صورت نمودار ہو جاتی ہے۔ کبھی معاملہ اس کے برعکس پیش آتا ہے۔ یہی حالات سیاسی اقتدار کے اِدھر سے اُدھر منتقل ہونے میں دیکھے جاتے ہیں۔

قرآن میں جا بجا امتِ محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بھی اور سابق انبیاء کی قوموں سے بھی ایسے وعدے کیے گئے ہیں کہ اگر تم راست روی اختیار کرو تو آسمان سے تم پر بارانِ رحمت برسے گی، یا یہ کہ خدا اولاد و اموال میں اضافہ کر کے تمہاری قوت بڑھائے گا۔

ایسے وعدوں کا تعلق اُسی مشیّتی نظام سے ہے جو موسمی اور طبعی دائرے سے لے کر تاریخی اور تمدنی دائرے تک نت نئے احوال و ظروف کو ظہور دیتا ہے۔ جب خدا چاہتا ہے تو کسی فرد یا قوم کے لیے احوال و ظروف زیادہ سازگار ہو جاتے ہیں اور جب وہ چاہتا ہے تو ان کی ناسازگاری میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

لیکن اس جبریت سے انسان کے محدود اختیارات اور اس کی اخلاقی ذمہ داری میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کو مختلف حالات (SITUATIONS) سے گذار کر ان کی آزمائش کرتا ہے کہ وہ سازگار حالات میں کیا روش اختیار کرتے ہیں؟ اور ناسازگار حالات میں وہ خدا پرستی اور نیکی کی راہ پر قائم رہنے کے لیے کہاں تک زور لگاتے ہیں؟ دونوں صورتوں میں ان کی سوچ بچار کیسے کام کرتی ہے؟ وہ قوتِ فیصلہ سے کس طرح کام لیتے اور کیا ارادے باندھتے ہیں؟ اور پھر ان کو جامۂ عمل پہنانے کے لیے عملی ذمہ داریاں کہاں تک انجام دیتے ہیں؟

بدلتے ہوئے احوال و ظروف، خصوصی واقعات، اتفاقی حوادث کو انسانی زندگی میں جو وسیع دخل حاصل ہے، اسی کو ملحوظ رکھتے ہوئے خدا پرست افراد و اقوام خدا کی رضا طلبی کی کوششوں کے ساتھ ساتھ اس سے مدد کی دعائیں کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ اپنے مشیّتی نظام میں تصرفات فرما کر طرح طرح کے کرشمے دکھاتا ہے۔

البتہ احوال و ظروف کی سازگاری اور ناسازگاری، اور حالات کی نت نئی مفید اور مضر کروٹوں کے بارے میں ہم تفصیل سے یہ نہیں جان سکتے کہ مصلحتِ الٰہی کیا ہے؟ کیونکہ اس کے سامنے بے شمار مخلوق، بے شمار انسانی افراد، اور بے شمار انسانی گروہوں کے بے حد وسیع معاملات ہوتے ہیں، درآنحالیکہ ہماری

فکر محض ایک محدود دائرے میں نگاہیں مرتکز کر کے کام کرتی ہے۔

(۲) مستفسر صاحب کے خط میں سوالات کا ایک جُز یہ بھی تھا جس کا جواب پہلے لکھا نہیں جا سکا کہ کیا وجہ ہے کہ جو بچہ کسی مسلمان گھرانے میں پیدا ہو جاتا ہے وہ مسلمان ہوتا ہے اور جو بچے کسی دوسرے مذہب والوں یا ملحدوں یا اشتراکیوں کے گھروں میں پیدا ہوتے ہیں وہ اپنے خاندان ہی کا راستہ اختیار کرتے ہیں؟

یہ بات تو خود حدیث ہی میں مذکور ہے کہ ہر بچہ فطرتِ اسلام لے کر پیدا ہوتا ہے (یعنی اس میں ایسے داعیات و رجحانات کارفرما ہوتے ہیں کہ اگر ان کو کام کرنے کا موقع ملے تو وہ تلاشِ حق کا سفر طے کر کے اسلام تک جا پہنچے گا)۔ مگر اس کے خاندان والے اسے یہودیت یا عیسائیت کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں۔ مزید یہ کہ وہ اسے تلاشِ حق اور جستجوئے صداقت کے جذبۂ عالی سے محروم کر کے تعصبات کے بندھنوں میں جکڑ دیتے ہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ جب یہ صورت ہے تو پھر غیر مُسلم خاندانوں میں پلنے والے بچوں کا کیا قصور؟ بات بڑی زوردار ہے۔ مگر اسی کے ساتھ ایک اہم حقیقت یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ ہر انسان کے ذہن میں سوال اٹھانے کی قوت رکھی گئی ہے، اور ہر آدمی بلوغ کو پہنچ کر جب عقل سے کام لینے کے قابل ہو جاتا ہے تو طرح طرح کے سوالات تنہائی میں، گفتگوؤں میں، مطالعہ کرتے ہوئے اس کے دل میں اُبھرتے ہیں۔ اس کا ضمیر اس سے ضرور پوچھتا ہے کہ تم جو زندگی بسر کر رہے ہو کیا اس پر مطمئن ہو کہ یہ ٹھیک ہے؟ تم نے جس مذہب یا تحریک کو اپنے خاندان یا اپنی قوم سے لیا ہے کیا وہ پُورے کا پُورا برحق ہے اور تمہارے لیے اور انسانیت کے لیے باعثِ فلاح؟ اور اس کے برحق ہونے کے کیا شواہد تمہارے پاس ہیں؟ اس کے علاوہ جو عقیدے، نظریے، مذاہب اور تہذیبی نظام پائے جاتے ہیں کیا تم نے ان کا جائزہ لے کر یہ جاننے کی کوشش کی کہ تمہارے اختیار کردہ راستے سے زیادہ بہتر کوئی دوسرا راستہ ہو؟

عام لوگ ان چُبھتے ہوئے سوالوں کو، جن کے جواب تک پہنچنے کے لیے محنت درکار ہوتی ہے: نذرِ تغافل کر دیتے ہیں اور ان کو ذہن سے نوچ کر لاشعور میں دھکیل دیتے ہیں۔ پھر اطمینان سے بنے بنائے نقشۂ زندگی میں مگن ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں نے مسلکِ آبا پرستی اختیار کیا کہ ہمارے آباؤ اجداد اور بزرگانِ سلف نے جو کچھ صحیح سمجھا وہ طے کر دیا۔ اب نہ کسی الہامی سند کی ضرورت، نہ کسی عقلی کاوش کی لیکن یہ سوالات آدمی کو مرتے دم تک چھوڑتے نہیں۔ وہ بار بار لاشعور کے بل سے نکل کر اس کے قلب و دماغ کو دستے

ہیں۔ اور تغافل و تساہل کے مرض انہیں بار بار نوچ کے پھینکتے رہتے ہیں۔ آخرت کی جوابدہی انہی سوالات کی بنا پر ہوگی کہ تمہارے دل میں ہماری دی ہوئی فطرت نے جو سوالات مسلکِ زندگی کی صحت و نادرستی کو جانچنے کے لیے بار بار اُبھارے تھے ان کا جواب معلوم کرنے کے لیے تم نے کیا کیا؟

دوسری طرف آپ کو ایسی ہستیاں ملتی ہیں کہ جنہیں ایک خاص طرز کا غلط ماحول پروان چڑھاتا ہے اور وہ ان کو اپنے رنگ میں رنگنے کے تمام وہ مروج اسلوب کام میں لاتا ہے جو بے شمار افراد پر کامیاب رہتے ہیں لیکن یہ ہستیاں ماحول کے اِس جبری سانچے کے خلاف لڑنے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوتی ہیں جس میں انہیں بچپن سے ڈھالنے کی ہر ممکن تدبیر کی جا چکی ہوتی ہے۔ آخر حضرت موسیٰ کس ماحول سے اُبھرتے ہیں؟ حضرت ابراہیمؑ کس خاندان میں آنکھ کھولتے ہیں؟ نبی آخر الزماںؐ کسی قوم کے نظامِ تربیت کے زیرِ سایہ آنکھ کھولتے ہیں؟ جدید دَور کی عام دنیوی نوعیت کی مثالیں لیجیے۔ وہ لوگ کیسے اُبھرے جنہوں نے جبری بادشاہیوں کے سائے میں پل پوس کر برطانیہ، فرانس اور امریکہ میں جمہوریت کا علم بلند کیا؟ زارِ روس کے استبداد کے شکنجے میں کسی ہوئی قوم کے اندر سے باغیانہ رجحان نمودار ہوا۔ سرمایہ دارانہ معاشرے میں نشو و نما پانے والے کارل مارکس نے اشتراکی نظریہ پر مبنی پرولتاری انقلاب کے خطوط تجویز کیے۔ خود ہمارے برِّصغیر میں انگریزی استبداد کے اندر رہنے والی آبادی میں آزادی کی تحریک برپا کرنے والے مسلم اور ہندو لیڈر اُبھرے۔ اسی طرح ہندو اکثریت کے مُسلم دشمن سامراجی عزائم کے بے نقاب ہو جانے پر اقبال نے فکری محاذ پر اور قائدِ اعظم نے آئینی سیاست کے محاذ پر ماحول سے جنگ آزمائی کی۔ اور ساری تاریخ کی رونق ایسی ہی ہستیوں سے ہے جنہوں نے بچپن سے ایک خاص طرح کی تربیت دینے والے ماحول کے دھارے کے خلاف پیرنے کی جرأت کی۔

ان مثالوں سے یہ ظاہر ہے کہ انسان میں قدرت نے ایسی صلاحیتیں رکھی ہیں اور ایسے محرّکات ودیعت کیے ہیں کہ وہ خوفناک ترین ماحول کے پنجرے سے ــــ خواہ وہ خاندانی ہو، یا سماجی یا سیاسی وا قتصادی ــــ لڑ سکتا ہے۔ وہ اس کے خلاف باغیانہ طرز پر سوچ سکتا ہے۔ وہ ایسی تربیت اور ایسی تعلیم کے خلاف بھی ناقدانہ اور باغیانہ طرزِ فکر کو کام میں لا سکتا ہے جس کے ذریعے اس کے ذہن و کردار کو ایک خاص شکل دینے کی کوشش مسلسل کئی برس تک کی گئی ہو!

آخر مشرکینِ مکہ کے بُت پرست معاشرے میں وہ چند نفوس بھی تو پوری طرح نمایاں ہیں جو حضور

خاتم النبیین کی بعثت سے قبل شرک اور مشرکانہ رسوم سے بیزار ہو کر سچی براہیمیت کا راستہ تلاش کرنے کے لیے مضطرب رہے اور بعض نے بڑی بھاری جدوجہد کی ؟

اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کسی غلط ماحول میں پرورش پانے کے باوجود اس کی غلطیوں اور خرابیوں کا شعور حاصل کر سکتا ہے، اس سے بیزار ہو کر صحیح راستے کی جستجو میں پڑ سکتا ہے، اور اگر اسے کوئی صحیح یا بہتر راستہ مل جائے تو وہ ماحول سے لڑ سکتا ہے۔ وہ عام لوگ جو داخلی محرکات کے موجود ہونے کے باوجود یہ پارٹ ادا نہیں کرتے وہ دراصل تساہل و تغافل کا شکار ہوتے ہیں۔ اور زندگی کے صحیح یا غیر صحیح ہونے کے مسئلے میں تساہل و تغافل کا رویہ خدا کے ہاں جرم ہے۔ زندگی کا اصلاح و فساد اتنا چھوٹا مسئلہ نہیں کہ اس کی پروا نہ کرنے والے انسانوں سے کوئی تعرض نہ ہو۔

یہ الگ بات ہے کہ کسی کو سعیِ تلاشِ حق کی راہ پر گامزن ہوتے ہوئے اگر فی الحقیقت لاینحل ذہنی یا خارجی موانعات پیش آئیں تو خدا کی عدالت ان کی رعایت دے دے۔ مگر جذبۂ تلاشِ حق سے کام لے کر امکانی حد تک سعی کرنے کا مکمل فقدان لازماً ایک جرم ہے۔

اب رہا ہم مسلمانوں کا معاملہ، سو ہمارے ہاں کمی یہ ہے کہ اسلام کو شعوری طور پر پیش کرنے اور عمل سے اس کی صداقت کی گواہی دینے کے لیے نظامِ ریاست کے پیمانے پر کوئی جامع اور ہمہ گیر تحریک مدتوں کارفرما نہیں رہی۔ حالات نے جس حد تک گنجائش دی، افراد اور اداروں نے محدود صورت میں حق کی گواہی دینے اور اسلام کی دعوت کا علم بلند کرنے کا کام ضرور کیا لیکن زندگی کے تمام شعبوں، تمام ممالک اور تمام طبقوں اور عناصر میں اسلام کا تحریکی عمل تسلسل سے جاری نہیں رہ سکا۔ بخلاف اس کے بہت سی مخالفانہ تحریکیں کارفرما ہوتی رہیں جن میں نیشنلزم اور سیکولرازم سے لے کر سوشلزم اور کمیونزم تک سبھی کو شمار کرنا چاہیے۔

اسلامی تحریک اگر کام کر رہی ہوتی تو وہ اسی طرح مسلم اور غیر مسلم حلقوں سے اپنے لیے ایمان و شعور رکھنے والے کارکن حاصل کرتی، جیسے وطنیت اور نسلی قوم پرستی اور سیکولرازم اور سوشلزم کی تحریکیں آج ہم مسلمانوں کے گھرانوں میں سے اپنے لیے کارکن حاصل کر کے ان کو اسلام کے خلاف اور ہم مسلمانوں کے خلاف استعمال کرتی ہیں۔

اسلامی تبلیغ کی منفرق کوششوں کے باوجود، اسلامی تحریک کے برسرِعمل نہ ہونے کی وجہ سے اسلام صرف خاندانی راستے سے بطور ایک میراث کے ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہونے لگا۔ یہ بھی غنیمت ہوتا۔

مگر بدقسمتی سے وہ پُورا اسلام نہیں ہے جو خاندانوں کے ماحول سے مسلمانوں کو ملتا ہے بلکہ وہ محض ایک جذباتی اور روایتی وابستگی، ایک غیر شعوری ایمان اور زیادہ تر ایک غیر عملی عصبیت ہے جو خاندانی ماحول مسلمانوں کی اولادوں کو دے رہا ہے۔ اسلام سے یہ کمزور قسم کی وابستگی اِس مصیبت کا باعث بنی ہے کہ ہمارے ہاں فکر و عمل کے خوفناک تضاد پائے جاتے اور منافقت کی رنگا رنگ اقسام رائج ہو گئی ہیں۔

بہرحال یہ ذمہ داری تو ہم مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے کہ ہم اپنے خاندانوں کے ماحول سے ملنے والے اسلام کے بارے میں اپنے ضمیر سے اُٹھنے والے سوالات کی روشنی میں یہ جاننے کی کوشش کریں کہ ہمیں جو کچھ میراث میں ملا ہے وہ کیا ہے؟ اس کی ضرورت و اہمیت پر غور کریں؟ اس کے بارے میں یہ جانیں کہ اس کے ایمانی و شعوری سرچشمے کیا ہیں اور ان کے ذریعے یہ معلوم کریں کہ اس دین یا نظام کی اصل حقیقت کیا ہے؟ اس کے تقاضے کیا ہیں؟ اور پھر سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں کہ آیا ہمیں صحیح اور مکمل اسلام کو لے کر چلنا ہے، یا اپنے ضمیر دل سے اٹھنے والے سوالات کو کچل کر اپنے آپ کو اسی بے معنی حالت میں مبتلا رکھنا ہے جس پر کسی نہ کسی حد تک اس ارشادِ الٰہی کا اطلاق ہو سکتا ہے کہ لَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ یعنی نہ اِدھر کے، نہ اُدھر کے۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم کی اِس کیفیت کی پُوری ذمہ داری خاندان اور معاشرے کے ماحول پر نہیں ڈالی جا سکتی، بلکہ بلوغ کو پہنچنے والا ہر فرد اپنے ذہن کی اُن استفہامی تحریکات کی بنا پر جوابدہ ہے جو اس کے اندر سمندر کی موجوں کی طرح اٹھتی رہتی ہیں، اور جن سے وہ بڑی حد تک باخبر ہوتا ہے (علیٰ نفسہ بصیرۃ)

(۸) اوپر کے اشارات سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ خدا نے نظامِ مشیّت اور نظامِ تکوینی کے لیے قوانین و نوامیس کی جو مشینری بنا دی ہے، اسے چلا کر وہ بے تعلق ہو گیا ہے، اور اب کسی طرح کے تصرف و مداخلت کا صدور اس کی طرف سے نہیں ہوتا۔

چونکہ اس کائنات کے مشیّتی و تکوینی نظام میں اس نے ارادہ، علم اور قوتِ فیصلہ رکھنے والی ایک مخلوق احسنِ تقویم پر پیدا کی ہے، اس لیے اس مخلوق کے رویّوں کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ طبعی اور تاریخی دونوں طرح کے احوال و ظروف میں بعض خاص تصرفات فرماتا ہے۔ وہ افراد اور اقوام کے لیے مختلف مراحل میں اور مختلف مواقع پر نقشۂ حالات کی ترتیب کو تبدیل کرتا رہتا ہے۔ کبھی نصرت و تائید کے لیے، کبھی سزا و تادیب کے لیے، کبھی آزمائش کے لیے اور کبھی تربیت کے لیے وہ افراد و اقوام کو ان کے رویّوں کے مطابق مختلف قسم کے احوال سے دوچار کرتا ہے جن میں بعض آہستہ آہستہ سلسلۂ علّت و معلول کے تحت رُونما

ہوتے ہیں، اور بعض غیر متوقع اور نادیدہ صورتوں میں۔

افراد اور اقوام کے رویوں کی تبدیلی کے ساتھ تکوینی اور طبعی اور تاریخی احوال میں ایسی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں جن کا جوڑ کائنات کے تکوینی و طبعی ضابطوں کے رُو سے آپس میں نہیں لگایا جاسکتا۔

یہی حقیقت ہے جس کی بنا پر توبہ و انابت اور دعا و عبادت کو اہمیت حاصل ہے۔ یہ مظاہر خدا پرستانہ رویّے کی روحِ رواں ہیں۔ ہم دعا اسی شعور کے تحت مانگتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے قائم کردہ تکوینی و مشیتی نظام میں تصرف کے بالاتر اختیارات حاصل ہیں، وہ کسی دوسری طاقت کے بناتے ہوئے قوانین کا پابند نہیں ہے، بلکہ اپنے بنائے ہوئے قوانین پر چلنے والے نظامِ وجود کا فرماں روائے مطلق ہے۔

یہ سوال کہ جب قوانین بنا دیے گئے تو پھر تصرّفِ خاص کے کیا معنی؟ اس کے جواب میں پچھلے نکات کی روشنی میں یہ حقیقت خود بخود واضح ہو جانی چاہیے کہ خود اس تصرّفِ خاص کے لیے بھی خدا نے کچھ قوانین وضع کیے ہیں جو انسانوں کے اخلاقی رویّوں اور تکوینی و تاریخی قوانین کے عمل میں ایک ایسا ربطِ پنہاں پیدا کرتے ہیں جسے خالص طبعی قوانین اور تاریخی ضابطوں کی بنا پر دریافت نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بالاتر حقیقت محض الہامی علم کے ذریعے واضح ہوتی ہے۔

(۹) آخر میں مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ مجھے کوئی ایسا مسلمان نہیں ملا جو جبریّتِ کاملہ کے غیر معتدل تصوّر کا کٹر سے کٹر علمبردار ہوتے ہوئے بھی، زندگی کے معاملات کو اس تصورِ جبریّت کے مطابق چلائے۔ یعنی اگر کھانے یا پہننے کو کچھ نہ ملے تو وہ کوئی تگ و دَو نہ کرے، اور بچہ بیمار پڑ جائے تو اس کے علاج کے لیے ہاتھ پاؤں نہ مارے، یا کوئی درندہ اس پر جھپٹنے والا ہو تو بچاؤ کی تدبیر نہ کرے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ اُس غیر اسلامی نظریۂ جبریت کا عملی اطلاق صرف دینی و اخلاقی ذمہ داریوں کے دائرے ہی میں کیا جاتا ہے۔

مَیں کہتا ہوں کہ جو رویّہ ہم دائرۂ معاش میں اختیار کرتے ہیں، وہی معاد میں کیوں اختیار نہیں کرتے؟ اور پھر اسی رویّے کے مطابق جبر و قدر کا وہ صحیح و متوازن تصوّر کیوں نہیں اپناتے جو اسلام دے رہا ہے۔

لیبیا میں سرقہ اور حرابہ کی حدود کا نفاذ

از جناب حبیب ریحان صاحب ندوی، لیکچرار اسلامک انسٹی ٹیوٹ البیضاء (لیبیا)

لیبیا کی حکومت نے گذشتہ سال رمضان المبارک میں اسلامی شریعت کے قیام اور اسلامی قانون کے نفاذ کا جو وعدہ کیا تھا اور کتاب و سنت پر حکومت کی بنیاد رکھنے کا جو اعلان کیا تھا، اس سلسلے کے کئی کام سال بھر ہوتے رہے، مثلاً قانونِ زکوٰۃ کا اجراء، شراب بندی کا قانون، اسلامی کانفرنس کا انعقاد اور شریعت کے سلسلے کی تفصیلی ابحاث، ان کمیٹیوں کا قیام جو شریعتِ اسلامیہ کی تطبیق کریں، بعض بنکوں سے سود کا خاتمہ۔ مزید اس سلسلے کے کام تیزی سے فاضل چیف جسٹس علی علی منصور کی نگرانی میں ہو رہے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک اہم اور عظیم الشان قانون لیبی حکومت نے جاری کیا ہے جو تاریخی اہمیت رکھتا ہے اور اسلامی شریعت کی زبردست فتح ہے۔ یہ قانون اِس سال ۴ رمضان المبارک ۱۳۹۲ھ مطابق ۱۱ راکتوبر ۱۹۷۲ء کو صادر ہوا ہے جس میں چوری کی اسلامی حد یعنی قطعِ ید تجویز کی گئی ہے۔ چور کے ہاتھ کاٹنے کے سلسلے میں بہت سی فقہی تفصیلات ہیں جو مذاہبِ اربعہ میں موجود ہیں، قانون میں ان تمام تفصیلات کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ انشاء اللہ اس موضوع پر مفصل مضمون ارسال کروں گا جس میں لیبی قانون پر تبصرہ بھی ہوگا، اس کی تلخیص بھی، اور حدِ سرقہ کے متعلق کچھ علمی، فقہی، تفسیری اور دوسری معلومات بھی۔

دوسرا قانون حرابہ کی حد بھی شرعی اصولوں کے ساتھ مقرر کی گئی ہے۔ اس کی رُو سے ڈاکہ اور قتل و غارت اور فساد فی الارض کی سزا بعض صورتوں میں قتل اور بعض صورتوں میں سیدھے ہاتھ اور اُلٹے پاؤں کو کاٹنے کی شکل میں نافذ کی جائے گی۔ اِس سلسلے میں بھی تفصیلات اور فقہاء کے اختلافات ہیں لیبی مقننوں نے ان دونوں قانونوں میں آسان اقوال اور سہل ترین فقہی احکامات نافذ کیے ہیں، اور اسلام کا فطری اصول اور مصلحتِ عام کا تقاضا بھی یہی ہے۔ لیکن پھر بھی ان اسلامی قوانین کا فائدہ بہت ہوگا اور لیبیا کے سابق قوانین اور سزاؤں کے مقابلے میں یہ سزا انتہائی موزون ہوگی اور جیلوں اور دوسری مشکلات کا قلع قمع ہو جائے گا۔ لیبیا میں ڈاکہ

قتل و فساد تو تقریباً ناپید ہے۔ اور چوری بھی بہت کم تھی لیکن اب کچھ واردا تیں بڑھ گئی ہیں۔ شریعت کے اس موزوں قانون اور خدا کی اتاری ہوئی آسمانی حد کے نافذ ہو جانے سے انشاء اللہ یہ کالعدم ہو جائیں گی۔

یہ دونوں قانون ایک ساتھ نکلے ہیں۔ ان کی مکمل تفصیل انشاء اللہ ارسال کروں گا۔ کاش وہ ممالک جہاں ہر سکنڈ چوری اور ہر ہر منٹ پر ڈاکہ اور قتل کی واردا تیں ہوتی ہیں، اسلامی شریعت کی قائم کردہ حدود کو اختیار کریں تو سوسائٹی چند دن میں جرائم سے پاک وصاف ہو جائے اور جیلوں کے لامحدود مصارف، وکیلوں کی لاتعداد بحثیں، ججوں کی غیر معمولی مشغولیات، عدالتوں کی مسلسل تعویق وتاخیر اور مقدمات کی کثرت چند ہی دن میں ختم ہو جائے اور پھر امن و استقرار اور سلامتی وسکون کی زندگی شروع ہو اور دنیا ہی میں "تحیتھم فیہا سلام" کا نقشہ انسانیت دیکھ لے۔

چوروں، ڈاکوؤں اور فسادیوں کی پشت پناہی اور ان پر رحم وکرم کے نت نئے بہانے ڈھونڈھنے والی مغربی ومشرقی سوسائٹیوں نے سالہا سال کے طویل اور تلخ تجربات کے بعد یہ اعلان کر دیا ہے کہ مادی فارغ البالی کے باوجود ہم جوع البحری میں مبتلا ہیں، ذہنی ناآسودگی ہمارا طرۂ امتیاز ہے، روحانی سکون اور چین ہم سے کوسوں دور ہے، ہم نے سائنسی ترقی میں ریکارڈ قائم کیا ہے اور چاند کی زمین چھو آئے ہیں، لیکن سطح زمین پر انسان بن کر چلنا ہم کو نہیں آیا ہے۔ ترقی یافتہ شہروں میں مغرب کے بعد سڑکوں پر چلنا دشوار ہو گیا ہے۔ ہر جان خطرہ میں ہے، ہر آبرو غیر محفوظ ہے، دن دہاڑے قتل وغارت اور ڈاکہ اور چوری عام ہے، ہر بنک اپنی پونجی ہمہ وقت لٹنے کا منتظر ہے اور ہر مسافر اپنی دولت اور جان دونوں کو ہتھیلی پر رکھ کر سفر کر رہا ہے

اس مضطرب اور پریشان انسانیت کو اگر سکون وچین حاصل کرنا ہے تو اسے اسلام کے دامن میں پناہ مل سکتی ہے۔ اور اسلام کی بین الاقوامی تعلیمات کسی قوم، کسی مخصوص نسل اور کسی خاص طبقہ کی ملک نہیں ہیں بلکہ ان کے تجربے کی کھلی دعوت انتہائی فراخ حوصلگی کے ساتھ اسلام ساری انسانیت کو دیتا ہے۔ سائنسی، اقتصادی، علمی، صنعتی اور ہر دور کے انسان کے لیے اس کی تعلیمات میں سکون واطمینان کا ایک معجزانہ اثر موجود ہے

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُم مَّوْعِظَةٌ	اے لوگو، تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے
مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى	نصیحت آگئی ہے، سینوں کی بیماریوں کے لیے شفا،
وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ (یونس: ۵۷)	ہدایت اور رحمت مومنین کے لیے۔

اور خدا کی طرف سے اس پُر نور اور آتشیں شریعت کا حامل اب قیامت تک محمد رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

الٓرٰ۔ کِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ اِلَيۡكَ لِتُخۡرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ ۙ بِاِذۡنِ رَبِّهِمۡ اِلٰى صِرَاطِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَمِيۡدِ۔ (ابراہیم: ۱)

یہ کتاب تمہاری طرف اس لیے اُتاری ہے کہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لاؤ، خدا کی اجازت کے بعد اس عزیز و حمید کی راہ مستقیم پر۔

ایمان اور رضا

— عبدالحمید صدیقی —

رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ

عالمِ مادّی میں اللہ تعالیٰ نے جس طرح بھوک اور پیاس کو مٹانے کے لیے اکل و شرب کا انتظام فرمایا ہے اُسی طرح روحانی احساسات کی تسکین کے لیے رضا اور ایقان کے حصُول کا طریقہ بتایا ہے۔ اپنی ذات اور اپنے رب سے راضی انسان ہی اپنے ماضی و حال سے مطمئن اور مسرُور رہتا ہے اور اللہ کے عدل و انصاف اور آخرت کی جزا و سزا کا یقین ہی اسے درخشاں مستقبل کا اطمینان دلاتا ہے اور نتیجۃً حقیقی سکُون عطا کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ایمان و ایقان سے محروم لوگ کبھی بھی حقیقی شادمانی حاصل نہیں کر سکتے۔ ان کی زندگی تلخ اور تاریک ہوتی ہے۔ وہ مسلسل غم، پیہم مصیبت اور ہمیشہ تنگدلی میں مبتلا رہتے ہیں۔ اپنے آپ سے بیزار اپنے ابنائے نوع سے ناراض اور دنیا کی ہر چیز کے خلاف نفرت کے جذبات پال کر وہ اس عالمِ فراخ کو اپنے لیے سوئی کے ناکے کی طرح تنگ اور محدود کر لیتے ہیں جس میں جینا ایک عذاب سے کم نہیں ہوتا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ بندۂ مومن بھی کبھی غم و حزن کا شکار ہو جاتا ہے لیکن اوّل تو اسے غمِ جاں نہیں غمِ جہاں ہوتا ہے، غمِ دنیا نہیں غمِ آخرت ہوتا ہے اور کبھی غمِ جان اُسے دامنگیر بھی ہو تو اُس کا اثر بالکل عارضی ہوتا ہے، اس لکۂ ابر کی مانند جو وسعتِ افلاک میں نمودار ہوا اور ایمان کی بادِ تند و تیز اُسے اُڑا لے جائے۔

حقیقتِ رضا کا شعور ان اسباب میں سے ایک ہے جو انسان کو ابدی سعادت سے ہمکنار کرتے ہیں۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

من سعادۃ المرءِ استخارتہ ربہ و رضاہ "اپنے رب سے استخارہ (طلبِ خیر) کرنے اور اُس کے

---

[1] یہ مضمون بھی شیخ یوسف القرضاوی کی کتاب الایمان والحیاۃ سے ماخوذ ہے [2] المائدہ: ۱۱۹۔

بما قضیٰ۔ و من شقاء المرء ترکہ الاستخارۃ و عدم رضاء بعد القضا۔ (مسند احمد۔ ترمذی۔ بخاری)

فیصلہ پر راضی ہو جانے والا انسان بڑا سعادت مند ہے۔ اور بڑا بدبخت ہے وہ شخص جو خدا سے نہ بھلائی طلب کرے اور نہ اس کے فیصلہ پر راضی ہو۔

یہی وجہ ہے کہ مومن ہر کام میں ہاتھ ڈالنے سے قبل اللہ تعالیٰ سے بھلائی کا طلب گار رہتا ہے۔ وہ دعا کرتا ہے:

اللّٰھم ان کنت تعلم ان ھٰذا الامر خیر لی فی دینی و معاشی و عاقبۃ امری فیسّرہ لی و بارک لی فیہ، و ان کنت تعلم انّ ھٰذا الامر شرّ لی فی دینی و معاشی و عاقبۃ امری فاصرفہ عنی و اصرفنی عنہ و اقدر لی الخیر حیث کان ثم رضّنی بہ۔

اے اللہ اگر تو اس کام کو میرے دین و دنیا کے لیے اور انجام کار کے طور پر میرے لیے بہتر سمجھتا ہے تو اسے مجھ پر آسان کر دے اور اس میں مجھے برکت دے۔ اور اگر تو اس کام کو بلحاظِ دین و دنیا اور بلحاظ انجام میرے لیے بُرا خیال فرماتا ہے تو اسے میری نظروں سے ہٹا دے اور مجھے اس کام سے باز رکھ۔ اور میرے لیے خیر کو مقدر فرما جہاں بھی ہو اور اُس خیرِ مقدر کے ساتھ مجھے راضی کر دے۔

چنانچہ مومن اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر ۔ خواہ وہ اچھی ہو یا بُری ۔ ہر حال میں راضی رہتا ہے۔ اور صبر و رضا کی یہ صفت اُس کے دل کو کشادہ اور سینے کو فراخ کر دیتی ہے۔ وہ نہ کبھی مغموم ہوتا ہے نہ تنگدل۔ نہ اُسے اپنے آپ پر غصہ آتا ہے نہ اس کائنات پر نہ زندگی پر اور نہ زندگی سے بہرہ ور مخلوقات پر۔ اس کے برعکس وہ اپنی ذات، اپنے گرد و پیش اور جملہ موجودات سے راضی اور خوش رہتا ہے کیوں کہ مسرت و رضا کا سرچشمہ اُس کے ہاتھ لگ چکا ہوتا ہے اور وہ ہے اللہ رب العٰلمین پر غیر متزلزل ایمان۔

رضا ایک بہت بڑی روحانی نعمت ہے جس سے اللہ کے منکر یا اُس کی ہستی اور اس کی جزا و سزا میں شک کرنے والے محروم ہیں۔ اس نعمت کو وہی حاصل کر سکتا ہے جس کا اللہ پر ایمان مضبوط ہو۔ اللہ تعالیٰ نے رسولِ پاک کو صبر و استقامت کے ساتھ اپنی حمد و ثنا اور بندگی و عبادت کرتے رہنے کی تلقین کی اور فرمایا لَعَلَّکَ تَرضٰی (یعنی اِس عملِ ایمانی کے نتیجے میں) ہو سکتا ہے کہ آپؐ نعمتِ رضا کو پالیں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ذاق طعم الایمان من رضی باللہ ربًّا و بالاسلام دینًا و بمحمد رسولًا۔ (رواہ احمد، ومسلم والترمذی)

جو شخص اللہ کے رب ہونے پر، اسلام کے دین ہونے پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے پر راضی ہو گیا اُس نے حلاوتِ ایمان کو چکھ لیا۔

قرآنِ پاک میں صحابۂ کرام کی سبقتِ ایمانی اور صداقتِ ایمانی کی شہادت دینے کے بعد ہی اللہ تعالیٰ نے انہیں رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ کا عظیم اعزاز عطا فرمایا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ مقامِ رضا پر فائز ہونے کے لیے دولتِ ایمان ناگزیر ہے۔

۱۔ مومن اپنی ذات اور اپنے رب سے راضی ہوتا ہے | اپنی ذات سے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے وجود اور شخصیت اور کائنات میں اپنے مرتبہ و مقام سے راضی ہے، کیونکہ اُسے معلوم ہے کہ وہ کوئی مہمل ہستی یا ناقص و حقیر چیز نہیں بلکہ خالقِ کائنات کی صفتِ صنعت گری کا شاہکار ہونے کی وجہ سے ایسی باشرف مخلوق ہے جو زمین پہ خدا کی خلافت کے منصبِ جلیل پر فائز ہے۔

علاوہ ازیں مومن اپنے رب سے بھی راضی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ اس کی صفاتِ کمال و جمال پہ ایمانِ کامل اور اس کے عدل اور رحم کا یقینِ محکم رکھتا ہے۔ اور اس کے علم و حکمت کی طرف سے بھی پُوری طرح مطمئن ہوتا ہے نیز وہ سمجھتا ہے کہ اللہ کا بے پایاں فضل اور اُس کے بے شمار احسانات اُس پر ہیں۔ بقول سیدنا ابراہیم علی نبینا علیہ السلام:

اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَھُوَ یَھْدِیْنِ ۝ وَالَّذِیْ ھُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ ۝ وَاِذَا مَرِضْتُ فَھُوَ یَشْفِیْنِ ۝ وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ ۝ وَالَّذِیْ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَلِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ ۝ (الشعراء: ۷۷: ۸۲)

میرا رب وہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا پھر وہی میری رہنمائی فرماتا ہے۔ جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے، جو مجھے موت دیگا اور پھر دوبارہ مجھ کو زندگی بخشے گا۔ اور جس سے میں اُمید رکھتا ہوں کہ جزا کے دن وہ میری خطا معاف فرما دیگا۔

غرض مومن اپنے حق میں اللہ کی تدبیر کو اپنی تدبیر سے بہت بہتر قرار دیتا ہے۔ وہ اس کے ہر کام کو سراسر رحمت اور سراپا خیر سمجھتا ہے۔ اور اگر اُسے خدا کی خدائی میں کہیں کوئی کجی نظر آئے تو اسے بھی وہ کجی پر محمول نہیں کرتا بلکہ تکمیلِ خیر کا سامان یا اثباتِ خیر کے لیے شرط لازم گردانتا ہے۔ مصیبت و تکلیف بلاشبہ شر ہے لیکن اس کے بغیر صبر کا دامنِ خیر بھی تو ہاتھ نہیں آسکتا۔ اسی طرح فقر و افلاس میں اگر ایک صورتِ شر موجود ہے تو انفاق فی سبیل اللہ اور سخاوت و کرم جیسی خیرات و حسنات کے امتیازات بھی اسی کے وجود سے نمایاں ہوتے ہیں لہٰذا اپنی ذات اور اپنے رب کی صفات میں کوئی چیز ایسی نہیں جو ایک بندۂ مومن کو ناراض کرنے والی ہو۔

۲۔ مومن حیات و کائنات سے بھی راضی ہوتا ہے | مومن یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ عالمِ موجودات اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے۔ اور اس کا ذرہ ذرہ اللہ کی بے مثال حکمت و دانائی پر دلالت کرتا ہے۔ اُس کے ہمہ گیر رحم و کرم کا

مظہر ہے اور اُس کے لامحدود علم و قدرت کا شاہکار ہے۔ اُسے اِس عظیم کائنات کی تدبیر و انتظام میں کہیں کوئی خرابی اور خلل نظر نہیں آتا۔ وہ انسانوں اور دوسری مخلوقات کو دیکھتا ہے تو اُن کے رزق کی تقسیم، اُن کا غم و انبساط، اُن کی عاجزی و درماندگی اور اُن کی قدرت و توانائی۔ کسی چیز میں بھی اُسے کہیں عدل سے انحراف اور ظلم کا شائبہ تک محسوس نہیں ہوتا۔ بلکہ حق اور سراسر حق ہی مشاہدے میں آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ حیات و موجودات کے اِس پُر حکمت، متوازن اور مبنی بر عدل نظام سے ایک ایماندار کو راضی ہونا ہی چاہیے۔

۳۔ مومن انعاماتِ خداوندی کا گہرا احساس رکھتا ہے | اپنے آپ سے بیزار رہنے اور زندگی کا گلہ شکوہ کرنے والے لوگ بالعموم وہ ہوتے ہیں جو موجود انعاماتِ الٰہی کا احساس نہیں رکھتے۔ وہ یہ تو کہتے ہیں کہ ہمارے پاس فلاں شے نہیں۔ ہمیں وہ اور وہ چیز چاہیے لیکن انہیں اظہارِ شکر کرتے کبھی نہیں سُنا گیا کہ یہ اور یہ نعمتیں ہمیں حاصل ہیں۔ اس کے برعکس مومن اللہ کے عظیم احسانات کے احساس سے ہر وقت سرشار رہتا ہے۔ وہ اِس بات کا گہرا شعور رکھتا ہے کہ اللہ نے اسے نسلِ انسانی کے ایک فرد کی حیثیت سے تخلیق کیا، علم و ادراک اور غور و فکر کی صلاحیتیں عطا کیں، نطق و بیان اور سماعت و بصارت سے نوازا، اُسے دست و پا دیے اور اُن میں فعل و عمل کی قوت و استعداد پیدا کی۔ اس کے پہلو میں دل پیوست کیا اور اُسے اخوت و محبت، رحم و شفقت اور ایثار و قربانی کے جذبات سے معمور کیا۔ اِس کے تن و شکم کی ضروریات کے لیے زمین نے رزق کے خزانے اگلے اور آسمان سے وحی الٰہی کے ذریعے اس کی فطری امنگوں اور روحانی تقاضوں کو پُورا کیا گیا۔ وہ جب غور کرتا ہے تو اپنی ذات میں بے شمار انعامات موجود پاتا ہے۔ حتیٰ کہ انفس و آفاق اُسے جلی و خفی نعمتوں سے مملو نظر آتے ہیں جن سے وہ براہِ راست یا بالواسطہ استمتاع کر رہا ہوتا ہے۔ ''وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا''۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو انعامِ الٰہی کا سب سے زیادہ شعور رکھتے تھے اُٹھتے بیٹھتے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتے رہتے اور جذباتِ تشکر و سپاس کا اظہار کرتے نہ تھکتے۔ مقصود یہ تعلیم دینا تھا کہ بندوں پر رحمتِ حق کی فراوانی صرف اِس بات کا ہی تقاضا نہیں کرتی کہ وہ اُس کا کبھی شکوہ نہ کریں اور ہمیشہ راضی رہیں بلکہ اس بات کا بھی تقاضا کرتی ہے کہ وہ رب العزت کی تحمید و توصیف میں ہر آن رطب اللسان رہیں۔

۴۔ مومن اللہ کی تقدیر پر راضی ہوتا ہے | مومن جو اپنے آپ کو ہر وقت انعاماتِ الٰہی کے بوجھ تلے دبا ہوا محسوس کرتا ہے اللہ کی مشیت اور تقدیر — خواہ وہ اچھی ہو یا بُری — پر بھی راضی رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اِس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی کام عبث، لایعنی اور خلافِ حکمت نہیں ہوتا اللہ تعالیٰ

خواہ مخواہ اپنے بندوں کو مصیبت میں مبتلا بھی نہیں کرتا۔ ایک مومنِ صادق کی نظر میں رب العزت اپنے بندوں کے لیے والدین سے بھی زیادہ رحیم و شفیق ہوتا ہے۔ اُس کی رحمت، اُس کے قہر و غضب، اُس کے مواخذہ و احتساب بلکہ ہر چیز پر حاوی ہے۔ پھر کسی طرح ممکن ہے کہ وہ اپنی مخلوقات میں سے کسی کے ساتھ ظلم کا ارتکاب کرے؟ اُس کا کوئی فیصلہ بظاہر ظلم بھی نظر آتے تو مومن اُسے بھی خیر اور رحمت ہی پر محمول کرتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَعَسٰٓی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّیَجْعَلَ اللّٰہُ فِیْہِ خَیْرًا کَثِیْرًا ○ (النساء ۴: ۱۹) تو ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور اللہ نے اُسی میں تمھارے لیے خیر کثیر رکھ دی ہو۔ اہلِ ایمان کا یہی وہ عقیدۂ رضا بالقضاء ہے جس کے خوشگوار اثرات کو مسلم معاشرہ میں رہنے والے بہت سے اہلِ مغرب نے بھی محسوس کیا ہے۔ انھی میں سے ایک مغربی اہلِ قلم ر۔ وی۔ سی۔ بوڈلے "مَیں نے اللہ کی جنت میں زندگی بسر کی" کے زیرِ عنوان لکھتا ہے۔

"۱۹۱۸ء میں مَیں اپنے ماحول کو چھوڑ کر شمالی مغربی افریقہ چلا گیا۔ وہاں مَیں نے بدوؤں کے درمیان صحرا میں سات برس گزارے۔ مَیں اُن کی زبان سیکھتا، انھی جیسا لباس زیب تن کرتا، اُن کے ساتھ کھاتا پیتا اور اُن کے سے ہی معمولاتِ زندگی اختیار کرتا تھا۔ اس عرصے میں مَیں نے اسلام کا گہرا مطالعہ کیا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایک کتاب تالیف کی جس کا نام الرسول ہے۔ وہ سال جو مَیں نے اُن خانہ بدوش عربوں میں بسر کیے میری زندگی کے بہترین سال تھے اور امن و سکون اور لذتِ حیات سے بھرپور بھی۔ مَیں نے اُن صحرا نشینوں میں رہ کر محسوس کیا کہ یہ لوگ انتہائی قلق و اضطراب کے عالم میں بھی پُرسکون رہتے ہیں۔ میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس بات کا مضبوط اعتقاد رکھتے ہیں کہ جو کچھ مقدر ہے ہو کر رہے گا، اُسے کوئی نہیں روک سکتا۔ اور کسی شخص کو وہی دکھ پہنچتا ہے جو اس کے لیے لکھ دیا گیا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ نزولِ بلا کے وقت ایک دوسرے پر تکیہ کر کے بیٹھ رہتے ہیں اور ہاتھ پاؤں باندھ کر مصیبت پہ مصیبت سہتے چلے جاتے ہیں۔ نہیں ہرگز نہیں۔ ایک واقعہ سُنیے:

ایک دن جھلسا دینے والی تیز ہوا چلی۔ وہ اتنی شدید تھی کہ صحرا کی بے شمار ریت اٹھاتے ہوئے بحرابیض متوسط عبور کر گئی اور اسے فرانس کی وادی آلرون میں جا پھینکا۔ سخت گرمی کی وجہ سے مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے سر کے بال جڑوں سے اکھاڑے جا رہے ہوں۔ غرضیکہ یہ مصیبت میرے لیے اتنی ناقابلِ برداشت تھی کہ مَیں پاگل ہوا جا رہا تھا۔ لیکن عربوں کی زبان پہ ایک حرفِ شکایت تک نہ آیا۔ زیادہ سے زیادہ

انہوں نے جو کچھ کہا وہ تھا "قضاءِ مکتوب" یعنی طے شدہ فیصلہ۔ وہ ایسے مواقع پر زیادہ سرگرمی سے کام کرتے۔ چنانچہ انہوں نے مُہلک لُو چلنے سے پہلے ہی اپنی بھیڑ بکریوں کے بچے ذبح کر دیتے۔ پھر ڈھور ڈنگر لے کر جنوب کی طرف پانی کے کنارے چلے گئے۔ اور کوچ کا یہ انتہائی تکلیف دہ کام انہوں نے کمال صبر و سکون اور خاموشی کے ساتھ انجام دیا۔ اُن کے قبیلے کے سردار نے کہا تو یہ کہ "ہمارا کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ ہم تو سب کچھ کھو کر بھی صبر کرنے کے عادی ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب کے ہمارے مویشی تقریباً چالیس فی صد زندہ بچ رہے ہیں انہی سے ہم نئے سرے سے کام کا آغاز کر سکتے ہیں۔"

۵۔ **مومن اللہ کے عطا کردہ رزق پہ راضی ہوتا ہے** مومن اللہ کی تقسیمِ رزق اور اُس کے مواہب و عطایا پر ــــ خواہ قلیل ہوں یا کثیر ــــ راضی رہتا ہے۔ اس لیے کہ اوّلاً وہ اپنے پاس موجود ہر نعمت کو سراسر اللہ کی رحمت اور اس کا فضل تصوّر کرتا ہے۔ ثانیاً اللہ تعالیٰ کو عادل اور حکیم سمجھتا ہے۔ اِن بنیادی حقائق کو ذہن نشین کرنے کے بعد اُسے مال و دولتِ دنیا کے بارے میں اللہ سے کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوتی۔ وہ رزقِ حلال کے لیے پوری کوشش کرتا ہے اور اس کوشش کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہو اُس پر قانع ہو جاتا ہے۔ اور اپنے سے زیادہ آسودہ و خوشحال لوگوں کی حالت پہ جلتا نہیں بلکہ اپنے نتائجِ محنت کو صبر و شکر کے ساتھ قبول کر لیتا ہے۔ یہی مفہوم ہے قناعت کا۔ لیکن بعض لوگوں نے تو لفظِ قناعت پہ ظلم ہی کر دیا۔ اُن کے خیال میں آدمی کمزوری و دوں ہمتی کی زندگی بسر کرے، ترقی و سربلندی کی خواہش کو یکسر پامال کر کے رکھ دے اور بھوک، افلاس اور محرومی ہی کو پسند کرنے لگے تو پھر وہ رضا و قناعت کی صفت سے متصف ہوتا ہے۔ حالانکہ نہ رضا کا یہ مقصود ہے اور نہ قناعت ہی کی یہ صحیح تعبیر ہے۔

اس سلسلہ میں دو باتوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے ــــ یہ حقیقت ہے کہ انسان کے دل میں محبتِ دنیا کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اور وہ مال و دولت کی شدید حرص رکھتا ہے۔ حدیثِ نبوی ہے:

لو کان لابن اٰدم وادیان من ذھب، لا تبغی ثالثاً، ولا یملأ عین ابن اٰدم الا التراب۔

اگر ابنِ آدم کو سونے سے معمور دو وادیاں بھی مل جائیں تو (اس کی حرص ختم نہیں ہوگی بلکہ) وہ ایسی ہی کسی تیسری وادی کی تلاش میں رہے گا۔ اُس کی آنکھ کو تو (قبر کی) مٹی ہی بھر سکتی ہے۔

انسان کی اِس انتہا پسند فطرت کو معتدل اور متوازن بنانے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ تعلیماتِ اسلام نے اس فرض کو

بحسن و خوبی انجام دیا اور ہوس کی آگ کو بہت کچھ ٹھنڈا کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یا ایھا الناس اتقوا اللہ واجملوا فی الطلب، فان نفسا لن تموت حتی تستوفی رزقھا، وان ابطأ عنھا، فاتقوا اللہ واجملوا فی الطلب، خذوا ما حل، دعوا ما حرم (ابن ماجہ)

اے لوگو اللہ سے ڈرو اور مال و دولتِ دنیا کی تحصیل میں حسنِ طلب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ کسی شخص کو اس وقت تک موت نہیں آتی جب تک وہ اپنے حصّہ کا رزق پورا پورا حاصل نہ کرے۔ اگر ملے شدہ رزق کے حصول میں تاخیر ہو رہی ہو تو اپنے اندر خوف خدا پیدا کرو اور حسنِ طلب سے کام لو۔ جو کچھ حلال ملے اُسے لے لو اور حرام سامنے آئے تو اُسے چھوڑ دو۔"

ایک اور مقام پہ فرمایا "لیس الغنیٰ عن کثرۃ العرض انما الغنی غنی النفس (متفق علیہ) غنا مال و اسباب کی زیادتی کا نام نہیں بلکہ یہ دل کی تونگری کا نام ہے۔ پس قناعت جو مطلوب اور محمود ہے یہ ہے کہ آدمی رزقِ حلال کے لیے سعی کرے اور جو کچھ پاکیزہ و طیب ملے اسے صبر و شکر سے قبول کرے۔ البتہ حرام سے پرہیز کرے چاہے وہ کتنا ہی ارزاں اور فراواں کیوں نہ ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ مؤخر الذکر ارشادِ رسولؐ اور بہت سی دیگر نصوصِ قرآن و سنّت ایک اور چیز کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں اور وہ یہ ہے کہ خوب سے خوب تر اور زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی خواہش کا رُخ دنیا کی ناپائدار چیزوں سے ہٹا کر عقبیٰ کی لازوال نعمتوں کی طرف پھیرنا چاہیے۔ نفس کی بُری اور ناپسندیدہ عادات کو تقویت دینے کے بجائے بندۂ مومن کے لیے ضروری ہے کہ ایثار و قربانی اور بذل و انفاق جیسی ارفع و اعلیٰ صفات کو اپنے اندر پیدا کرے۔ قناعت کا یہ پہلا مفہوم ہے۔

دوسری بات جسے قناعت کے ضمن میں سمجھنے کی ضرورت ہے یہ ہے کہ دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو بعض لوگوں کو تو بغیر کسی کوشش کے مل جاتی ہیں مگر بعض دوسرے حضرات کو نہیں ملتیں اور وہ کوشش بھی کریں تو نہیں مل سکتیں۔ مثلاً خوبصورت اور نوجوان ہونا۔ بلند قامت اور صحتمند ہونا، بے غم ہونا یا کثیر الاولاد ہونا۔ اب اگر کوئی بدصورت یہ کوشش کرے کہ وہ حسن و جمال کا پیکر بن جائے تو یہ ناممکن ہے۔ کوئی پیرِ فرتوت عہدِ شباب کو لوٹانا چاہے تو ظاہر بات ہے اسے ناکامی ہوگی۔ کسی کوتاہ قد کا یہ ارمان کہ وہ بلند قامت ہو جائے کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح پے در پے غموں اور صدموں سے نڈھال انسان ہشاش بشاش رہنا چاہے یا کوئی ثمرِ زندگی سے محروم، عمر کے آخری حصے میں فرزندِ ارجمند کا منہ دیکھنا چاہے تو شاید ان حضرات کی آرزوئیں بھی پوری نہیں ہو سکتیں۔ ایسے لوگوں کو ایمان باللہ بتاتا ہے کہ غنا و سعادت اس چیز کا نام نہیں کہ آدمی اپنی

جملہ خواہشات کی تکمیل میں کامیاب رہے بلکہ غنا و سعادت کا راز خدا کی تقسیم اور تقدیر پر راضی رہنے میں مضمر ہے۔ ارشادِ رسولؐ ہے اِرضَ بما قسم اللہ لک تکن اغنی الناس "جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تیری قسمت میں لکھا ہے اس پر راضی ہو جا، تو تمام لوگوں سے زیادہ غنی ہو جائے گا۔ ما قلّ وکفٰی خیرٌ مما کثُرَ والھٰی۔ قلیل اور کفایت کرنے والی نعمتیں بہت بہتر ہیں کثیر مگر غافل کر دینے والے انعامات سے۔ دین کی ان تعلیمات کی بدولت محروم لوگ اپنی تلخ اور ناگوار زندگی کو بھی گوارا بنا لیتے ہیں اور پھر اُن کا نفس کبھی ناممکنات اور محالات کی طلب کے درپے نہیں رہتا۔ یہ قناعت کا دوسرا مفہوم ہے ؎

اِنّ الغنیّ ھو الغنیّ بنفسہٖ ولو انہ عاری المناکب حافٍ
ما کُلّ ما فوق البسیطۃِ کافیاً واذا قنعت فبعض شیءٍ کافٍ

(ترجمہ) غنی وہی ہے جو دل کا غنی ہو اگرچہ اس کا دوش بے لباس اور پا برہنہ ہوں۔ روئے زمین پہ جو کچھ بھی ہے اگر سارے کا سارا تجھے مل جائے تو کافی نہ ہو لیکن اگر تو قانع ہو جائے تو معمولی چیز بھی تجھے کفایت کر سکتی ہے۔

ایک نوجوان کا قصہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تیرہ افراد پر مشتمل ایک یمنی وفد آیا۔ آپؐ اس کی آمد سے بہت خوش ہوئے اور وفد کے ارکان کی خوب عزت و تکریم کی۔ دورانِ قیام انھوں نے مختلف امور کے متعلق استفسار کیا اور علمِ دین حاصل کرتے رہے۔ یہ لوگ آپ کے پاس زیادہ عرصہ نہیں ٹھیرے۔ اُن کی خواہش تھی کہ جلد از جلد واپس جائیں۔ اور اپنے اہلِ وطن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے آگاہ کریں۔ چنانچہ چند دن ٹھیرنے کے بعد وہ رخصت ہوتے وقت آپ کے پاس آئے تو آپؐ نے حضرت بلالؓ کو بھیجا۔ تاکہ انہیں عام وفود سے بہتر ہدایا و تحائف پیش کریں۔ جب وہ تحائف وصول کر چکے تو آپؐ نے فرمایا "تمہارا کوئی ساتھی محروم تو نہیں رہا؟" انھوں نے جواب دیا کہ ایک لڑکا ہے جسے ہم اپنے سامان کے پاس پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ آپ نے فرمایا "اُسے بھی ہمارے پاس بھیج دینا"۔ واپس جا کر انھوں نے لڑکے سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ اور اپنی کوئی حاجت ہے تو پوری کرا لو۔ لڑکا آپ کے پاس آیا اور عرض کرنے لگا "یا رسول اللہ میں بنی ابذی کا فرد ہوں اور اُس وفد کے ساتھ یہاں آیا تھا جو ابھی آپ کے پاس حاضر ہوا تھا۔ آپؐ نے اُن کی حاجات تو پوری کر دی ہیں ایک میری حاجت بھی پوری کر دیجیے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا "تیری حاجت کیا ہے"؟ لڑکا بولا "میری حاجت میرے ساتھیوں جیسی نہیں۔ وہ لوگ آئے تو اسلام کے لیے تھے لیکن دنیا کا مال و متاع لیکر

گئے ہیں۔ میں واللہ صرف اس لیے آیا تھا کہ آپؐ میرے حق میں اللہ سے یہ دعا کریں کہ وہ میری مغفرت فرمائے مجھ پر رحم کرے اور میرے دل کو غنی بنا دے۔ آپؐ نے اُسی وقت لڑکے کی طرف رُخ پھیرا اور دستِ دعا اٹھا دیئے: اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَہٗ وَارْحَمْہُ وَاجْعَلْ غِنَاہُ فِیْ قَلْبِہٖ" پھر اُس لڑکے کو بھی ویسے ہی تحائف عطا کرنے کا حکم دیا جیسے اُس کے ساتھیوں کو دیئے جا چکے تھے۔ اور اس کے بعد یہ حضرات خوشی خوشی یمن روانہ ہو گئے۔

اس واقعہ کو کافی عرصہ بیت گیا۔ حجۃ الوداع کے موقع پر پھر یہی لوگ منیٰ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور اپنا تعارف کرایا۔ آنحضرتؐ نے دریافت فرمایا اُس لڑکے کا کیا حال ہے جو تمہارے ساتھ آیا تھا کہنے لگے یا رسول اللہ! اُس جیسا آدمی ہم نے کوئی نہیں دیکھا۔ نہ اُس سے زیادہ قناعت کرنے والا کوئی شخص ہمارے علم میں ہے۔ اگر لوگ ساری دنیا کا مال و دولت بھی آپس میں بانٹ رہے ہوں تو وہ اُن کی طرف بالکل التفات نہیں کرتا۔ اِس پر آپؐ نے فرمایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اِنِّیْ لَاَرْجُوْ اَنْ یَّمُوْتَ جَمِیْعًا۔ مجھے پوری امید ہے کہ اس کی موت بھی عالمِ یکسوئی میں واقع ہو گی۔ اُن میں سے ایک صاحب نے پوچھا "اے اللہ کے رسول کیا ہر شخص یکسوئی کی حالت میں نہیں مرتا؟" آپؐ نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا "بعض لوگ پراگندگی فکر کے ساتھ مرتے ہیں۔ وہ بسترِ مرگ پر پڑے ہوتے ہیں لیکن اُن کی خواہشات اُن کے افکار، اُن کے پروگرام اور منصوبے انہیں نہ معلوم کہاں کہاں لیے پھرتے ہیں۔ ایسے لوگ جو عالمِ نزع میں بھی یکسو نہیں ہوتے اللہ کو اُن کی کچھ پروا نہیں کہ وہ کس چیز کے غم میں اور کس حالت میں مر رہے ہیں۔" یہ سُن کر انہوں نے کہا "مگر وہ نوجوان تو ہمارے درمیان بہترین زندگی بسر کر رہا ہے۔ دنیا کی محبت اس کے دل میں مطلق نہیں اور اللہ کے دیئے ہوئے رزق پر پوری طرح قانع ہے۔"

آنحضرتؐ کی وفات کے بعد ارتداد کا جو طوفان اٹھا اُس کی رَو میں بہت سے اہلِ یمن بھی بہ گئے۔ اِس موقع پر یہی نوجوان اپنی قوم کو خدا یاد دلاتا رہا اور انہیں اسلام کی حقانیت اور قدر و قیمت بتاتا رہا نتیجۃً اس کی قوم کا کوئی فرد مرتد نہ ہوا ـــــ اِس نوجوان کے قصے سے ہمیں کئی سبق ملتے ہیں۔

پہلا سبق تو یہ ہے کہ آدمی کو اُس کے حصّہ کا رزق مل کے رہتا ہے۔ اہلِ وفد اُسے پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ لیکن آپؐ نے استفسار کر کے اسے بُلوایا اور تحائف دیئے۔ دوسرا سبق یہ ہے کہ دولتِ اسلام کے لیے فکرمند شخص دولتِ دنیا سے محروم نہیں رہتا۔ تیسرا سبق یہ ہے کہ اللہ سے رحم و مغفرت اور غنائے نفس کا طلبگار بارگاہِ خدا و رسولؐ میں ایک مقامِ خاص کا حقدار بن جاتا ہے جو دوسرے لوگوں کو نصیب نہیں ہوتا۔ دیکھیے کئی سالوں کے

بعد جب اہلِ وفد سے دوبارہ ملاقات ہوئی تو آپؐ نے بطورِ خاص اس لڑکے کے حالات دریافت فرمائے۔ ایک اور سبق جو سب سے اہم ہے یہ ہے کہ قناعت شعار آدمی کو زندگی میں یکسوئی حاصل ہوتی ہے۔ اور موت کے وقت بھی اُس کی توجہ صرف ایک ہی ذات پر مرتکز رہتی ہے۔ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝

۴۔ قناعت و رضا سرچشمۂ قوت ہے: بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ غربت و قناعت کی وجہ سے انسان میں ضعف و اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وہ معاشرہ میں اپنا مرتبہ و مقام کھو بیٹھتا ہے۔ ہماری رائے میں یہ خیال قلتِ فکر کا نتیجہ ہے۔ ہم تو دیکھتے ہیں کہ جتنی خودداری اور عزتِ نفس اور اپنے موقف پر ڈٹ جانے کی طاقت قناعت شعار لوگوں میں پائی جاتی ہے اتنی مزاحمت کسی بڑے سے بڑے دولتمند اور بااثر آدمی میں بھی موجود نہیں ہوتی۔ تاریخ کے صفحات بھی اِسی حقیقت پہ شاہد ہیں کہ ظلم و جور کا مقابلہ کرنے والے، اپنے حقوق کے لیے لڑنے والے اور باجبروت حکمرانوں سے حق و صداقت کی بنیاد پہ ٹکرا جانے والے لوگ بالعموم وہی ہوتے ہیں جنہیں دنیا کمزور اور بے وسیلہ سمجھتی ہے۔ مگر جو تقدیر پہ شاکر اور مصیبت و ابتلا پہ راضی رہنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک قناعت شعار شخص امیروں کے محلات، بادشاہوں کے خزانوں، اور عیش و عشرت میں پلنے والے لوگوں کے ساز و سامان کو اسی نگاہ سے دیکھتا ہے جس طرح کہ بلند فضا میں اُڑنے والا پرندہ پستی کی طرف دیکھتے ہوتے یہ محسوس کرتا ہے کہ رفیع الشان محلات ریت کے گھروندے ہیں، انسان محض چیونٹیاں ہیں جو زمین پر رینگ رہی ہیں۔

سیّدنا مسیح علیہ السّلام کا فرمان ہے، اون میرا لباس ہے۔ نانِ جویں میرا طعام ہے اور چاند میرا چراغ ہے۔ میرے پاؤں میری سواری ہیں اور میرا بازو میرا تکیہ ہے۔ میں رات بسر کرتا ہوں تو میرے پاس (اِن چیزوں کے سوا) کچھ نہیں ہوتا۔ اور دن گزارتا ہوں تو اِسی حال میں۔ بایں ہمہ روئے زمین پہ مجھ سے زیادہ غنی اور بے نیاز کوئی نہیں۔ امام غزالیؒ نے اپنی کتاب "احیاء العلوم" کے باب الامر بالمعروف والنہی عن المنکر میں ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ صبر و قناعت کی زندگی بسر کرنے والا ایک بوڑھا راہ چلتے چلتے کوئی کھجور کی گٹھلی نظر آتی تو اُسے اُٹھا لیتا کہ یہی اس کا رات کا کھانا ہوتا تھا۔ ایک دن اس بوڑھے کو ایک نوجوان ملا جس کے پاس ایک آلۂ موسیقی تھا۔ اس پہ ہارون الرشید کی لونڈی گایا کرتی تھی۔ بوڑھے نے اس آلہ کو توڑ دیا۔ ہارون کو خبر پہنچی تو غضبناک ہو گیا اور بوڑھے کو بلا بھیجا۔ جب وہ ہارون کے پاس پہنچا تو اس نے کہا "بڑے میاں آپ کو یہ کام کرنے پر کس چیز نے مجبور کیا" بوڑھے نے پوچھا کونسا کام، اب ہارون یہ تو نہ کہہ سکتا تھا کہ تُو نے

مغنیہ کا آلہ موسیقی توڑ دیا ہے۔ وہ بار بار اپنا ہی سوال دُہراتا چلا گیا۔ بوڑھا خلیفہ کی کمزوری سمجھ گیا اور کہنے لگا "جناب آپ کے باپ دادا منبر رسول پر خطبہ جمعہ کے دوران یہ آیت پڑھا کرتے تھے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ (النحل: ۹۰) اللہ عدل اور احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے سو حضور والا! میں نے ایک برائی دیکھی اُسے مٹا دیا۔ اب آپ کو اعتراض کس چیز پر ہے؟ ہارون کو بھی کہنا پڑا کہ اسے توڑنا ہی دینا چاہیے تھا۔ واقعہ کا راوی کہتا ہے اس کے بعد بوڑھا اُٹھا اور نکل گیا۔ ہارون نے اس کے پیچھے ایک آدمی کو دس ہزار درہم کی ایک تھیلی دیکر بھیجا کہ اگر بوڑھا لوگوں سے اس بات کا ذکر نہ کرے تو اسے تھیلی دے دینا بصورتِ دیگر واپس لے آنا۔ چنانچہ وہ آدمی بوڑھے کے تعاقب میں نکلا تو اسے دیکھا کہ زمین میں دھنسی ہوئی ایک گٹھلی کو نکالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اُس نے اُسے تھیلی کی پیش کش کی اور کہا کہ امیر المومنین کی طرف سے اسے قبول فرمائیں۔ بوڑھے نے جواب دیا "خلیفہ سے کہو یہ رقم جہاں سے لی ہے وہیں لوٹا دے۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں"۔ اور دوبارہ گٹھلی کے ساتھ مشغول ہو گیا۔ اور یہ اشعار گنگنانے لگا ؎

اَرَى الدُّنْيَا لِمَنْ هِيَ فِيْ يَدَيْهِ ہُمُوْمًا كُلَّمَا كَثُرَتْ لَدَيْهِ
تُهِيْنُ الْمُكْرِمِيْنَ لَهَا بِصُغْرٍ وَتُكْرِمُ كُلَّ مَنْ هَانَتْ عَلَيْهِ
اِذَا اسْتَغْنَيْتَ عَنْ شَيْءٍ فَدَعْهُ وَخُذْ مَا اَنْتَ مُحْتَاجٌ اِلَيْهِ

معلوم ہوا کہ قناعت شعار لوگ ہی دراصل طاقتور ہوتے ہیں۔ حق گوئی اور بے باکی سے کام لیتے ہیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سر انجام دے سکتے۔ ان کی عزتِ نفس اور خودداری انہیں اُمراء و ملوک سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ اس وجہ سے عامۃ الناس بھی اُنہیں سر آنکھوں پہ بٹھاتے ہیں۔ یہ لوگ جو رضا و قناعت کے پیکر ہوتے ہیں کبھی کفر و باطل پہ سکوت اختیار نہیں کرتے۔ ان میں اتنی جرأت ہوتی ہے کہ بڑے بڑے جابر سلاطین کے سامنے بھی کلمۂ حق کہہ سکیں۔

---

[1] میں دیکھ رہا ہوں کہ جس کے ہاتھ میں بہت زیادہ مال و دولتِ دنیا ہو اُسے بکثرت غم و افکار لاحق رہتے ہیں۔ اور جو لوگ دنیا کو عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں دنیا انہیں ذلیل کرتی ہے۔ اور جو اسے ہیچ سمجھتے ہیں یہ انہیں معزز ٹھہراتی ہے۔ جب تجھے ایک چیز کی ضرورت نہیں تو اُسے حاصل کرنے کی فکر چھوڑ۔ ہاں جس چیز کی تجھے حاجت ہے اُسے لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

بقیۂ اشارات

اچھی طرح واقف ہیں۔ ان حالات میں آپ جب ایسی "عالمانہ" گفتگو فرماتے ہیں تو اس سے آپ کے وقار اور علمی ساکھ میں تقیناً کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ وہ شخص آپ کا سخت دشمن ہے جو آپ کو اس فریب میں مبتلا کر رہا ہے کہ مولانا کی کتابوں اور مولانا کے زیر ادارت شائع ہونے والے مجلے کا نام لے کر، اگر مولانا کو گالیاں دی جائیں تو اس سے آپ کا سیاسی مرتبہ بلند ہونے کے علاوہ آپ کے علمی مقام میں بھی اضافہ ہو سکے گا۔

اِدارۂ بتُول، لاہور

ایک ضرُوری اعلان

اِدارۂ بتُول کے دفاتر کے پتے تبدیل ہو گئے ہیں۔ آئندہ ماہنامہ نُور اور بتُول کے سلسلے میں خط و کتابت اور رابطہ کے لیے حسبِ ذیل پتوں سے رجُوع کیا جائے

۱۔ مضامین ارسال کرنے اور ادارتی امُور کے بارے میں:

محترمہ حمیدہ بیگم صاحبہ، ۱۳۔غزالی پارک، وحدت کالونی، لاہور

۲۔ خریدار اور ایجنٹ حضرات کے لیے: رقوم بھجوانے، پرچوں اور کتب کا آرڈر دینے اور شکایات اور انتظامی امُور کے لیے:

ناظمِ ادارۂ بتُول، ۳۵۔افغانی روڈ، سمن آباد لاہور

ضروری اعلان

ماہنامہ "ترجمان القرآن" کے خریدار اور ایجنٹ حضرات کی خدمت میں گذارش ہے کہ ترجمان القرآن کی اشاعت کے لیے جتنا کاغذ کا کوٹہ ماہوار درکار ہوتا ہے، پرمٹ پر اتنا نہیں ملتا۔ جس کی وجہ سے باقی کاغذ بازار سے گراں نرخ پر خرید کر پرچے کی مطلوبہ تعداد پوری کرنی پڑتی ہے۔

اس لیے مجبوراً ہمیں پرچے کی قیمت میں اضافہ کرنا پڑ رہا ہے۔ لہٰذا ماہ دسمبر سنہ ۵۲ء سے قیمت فی پرچہ ایک روپیہ اور سالانہ چندہ دس ۱۰ روپے ہوگا

مینیجر ترجمان القرآن

اچھرہ۔ لاہور